کائناتِ دل



کائناتِ دل

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

دوسرا ایڈیشن

(خلاصہ برائے طلبا)

مطبوعہ

محبوب المطابع برقی پریس۔ اردو بازار دہلی

تعداد اشاعت ۱۰۰۰ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ علاوہ محصول ڈاک

ناشر

آدرش کتاب گھر بلبلی خانہ دہلی

تعارف

(طالب دہلوی)

بزرگ محترم حضرت منشی بشیشور پرشاد صاحب منورؔ لکھنوی کا جنم لکھنؤ کے ایک علم دوست کائستھ (سکسینہ) گھرانے میں جولائی ۱۸۹۷ء میں ہوا۔ ادبی ذوق آپ نے ورثے میں پایا۔ آپکے والد محترم ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افقؔ تخلص آشیانی کے ادبی کمالات سے کون واقف نہیں۔ آپ نے اپنا راہبرِ سخن منشی نوبت رائے نظرؔ کو بنایا۔ جن کا شمار اپنے وقت کے مشاہیر غزل گو شعرا میں ہوتا تھا۔ آپ خود ارشاد فرماتے ہیں ؎

منورؔ خوں رگوں میں ہے افقؔ سے کاملِ فن کا
ہدایت میں ہوں میں نازاں نظرؔ سے کاملِ فن پر

ستمبر ۱۹۱۳ء میں آپ اپنے باکمال اور شفیق باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ اس سے چھ ماہ پیشتر آپ کو اپنے بڑے بھائی منشی رام شنکر پرشاد کی جوانامرگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ موصوف ۲۷ سال کی عمر میں دفعتہً مرضِ طاعون میں مبتلا ہو کر راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ مرحوم ایک ہونہار مضمون نگار تھے۔ اخبار تفریح لکھنؤ کے ایڈیٹر اور "اودھ اخبار" کے حلقۂ ادارت کے رکنِ رکین تھے۔ حضرتِ افقؔ فرزندِ اکبر کی مفارقت برداشت نہ کر سکے، اور چھ ماہ بعد بعمر ۵۹ سال آپ نے پیکرِ عنصری کو خیرباد کہہ دیا۔

حضرت منورؔ کی شاعری کی ابتدا ۱۹۱۰ء سے ہوتی ہے۔ آپ نے اپنی مسلسل کوشش اور فطری ذہانت سے بہت تھوڑے عرصے میں قابلِ رشک ترقی کی اور صحیح معنوں میں حضرات افقؔ و نظرؔ کی جانشینی کا فخر حاصل کر لیا۔

آپ خاندانی شاعر ہیں، چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں ؎

شاعری سے نہ منوّر کو ہو کیوں کر رغبت پانچ پشتوں سے یہی شوق چلا آتا ہے

یہ سلسلہ منشی اودے راج مطلع کی ذات سے شروع ہوتا ہے۔ منشی ایشری پرشاد شعاعی اُن کے باکمال فرزند تھے۔ دونوں بزرگوں کے فارسی کلام کا کچھ حصہ اب تک محفوظ ہے۔ پورن چند ذرّہ شعاعی مرحوم کے فرزند تھے، اور نثر نگاری میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اخبار "تمنّائی" کی بنا اُنھوں نے ہی ڈالی، جو جناب تمنّا کی زیرِ ادارت عرصے تک لکھنؤ سے نکلتا رہا۔

منشی رام سہائے تمنّا، منشی پورن چند ذرّہ کے فرزندِ اکبر تھے۔ آپ نے نظم و نثر دونوں میں دل کھول کر داد دی ہے۔ بھگوت گیتا منظوم اور رباعیات عمر خیام کا اردو رباعیوں میں ترجمہ آپ کی یادگار ہے۔ ۱۹۳۲ء میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

منشی پورن چند ذرّہ کے دوسرے صاحبزادے منشی ماتا پرشاد نیساں رنگِ قدیم کے کہنہ مشق اور رنگین بیان شاعر تھے۔ آپ نے متعدد ہندستانی ریاستوں کی تواریخ نظم فرمائیں۔ منشی پورن چند ذرّہ کے تیسرے صاحبزادے ملک الشعرا حضرت افق نہ صرف اپنے خاندان کے لئے بلکہ قوم کے لئے مایۂ ناز تھے۔ تمام ملک نے آپ کا زورِ قلم تسلیم کیا ہے۔ دکن اور پنجاب میں خاص طور پر قدردانی ہوئی۔ اُردو میں منظوم اخبار نکالنے کا فخر صرف آپ ہی کو حاصل ہوا۔ رامائن یک قافیہ۔ گورو گوبند سنگھ کی منظوم سوانح عمری، مہابھارت اور ٹاڈ راجستھان کے تراجم آپ کی لاثانی یادگاریں ہیں۔ الف لیلیٰ کا ترجمہ (نظم و نثر) نول کشور پریس کے ہنر شناس مالک آنریبل رائے بہادر منشی پریاگ نرائن بھارگو کے ایما سے کیا جس کی ضخیم جلدیں پریس میں اب تک موجود ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ آج تک شائع نہ ہو سکیں۔ کئی ناول اور ڈرامے بھی آپ کی تصنیف ہیں۔ ایسی ذہین اور طباع ہستیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ طبیعت میں استغنا حد درجے کا تھا۔ آپ ایک آزاد منش اور رند مشرب بزرگ تھے۔

لکھنؤ کے مشہور کامل فن شاعر اور ادیب منشی لچھمن پرشاد عمار رجناب منور کے خسر تھے،
تاریخ گوئی میں آپ کو خاص کمال حاصل تھا۔ فارسی کے جید فاضل تھے۔ زیادہ تر کلام
فارسی میں ہے، جو نہایت بلند پایہ ہے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔
اس سلسلے میں یہ ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ منور صاحب کی چچی صاحبہ محترمہ
کشن پیاری شعر فرماتی تھیں، اور آپ کی بڑی بہن شریمتی دھرم دیوی دھرم ہندی اور
اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن فرماتی ہیں۔
منشی شنکر دیال فرحت کا نام کس اردو داں نے نہ سنا ہوگا۔ آپ حضرت آفق
کے ماموں تھے۔ آپ کی رامائن آج بھی اہل عقیدت سے داد لیتی ہے۔ حضرت
جگدمبا پرشاد قیصر لکھنوی منور صاحب کے ماموں تھے۔ افسوس ہے کہ وہ بھی آج
ہم میں موجود نہیں۔ غرضکہ ؎

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

جناب منور صاحب نے بجا طور پر اپنی خاندانی عظمت کے متعلق فرمایا ہے ؎

ملا تھا ورثہ اجداد میں جو باغ سخن — وہ پائمالِ ستمگاریٔ خزاں نہ ہوا
آفق کے فیض کا دریا ہے آج تک جاری — ہزار شکر کہ بے نشاں خانداں نہ ہوا

محترمی منور صاحب بسلسلۂ ملازمت لکھنؤ سے تبدیل ہو کر دہلی ۱۹۲۷ء میں آگئے، اور اب تک
یہیں مقیم ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں آپ کے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ بعنوان "نسیم عرفاں" شائع
ہوا۔ "کائنات دل" پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے آپ مرحوم
دیش بندھو سی، آر، داس کی تصنیف "ساگر سنگیت" کو "بحر ترنم" کے عنوان سے اردو
میں پیش کر چکے ہیں۔ اور یہ ترجمہ رسالہ "زمانہ" کانپور میں شائع ہو چکا ہے۔ قرآن شریف
کی کئی سورتوں کا ترجمہ بھی آپ نظم فرما چکے ہیں۔ اور اگرچہ ابھی اس کے شائع ہونے کی نوبت
نہیں آئی ہے۔ لیکن یہ مختلف اسلامی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

یہ روداد یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ترجمے کے شوق نے آپ کو کالی داس کی خوشہ چینی پر بھی آمادہ کیا، جس کا نتیجہ "کمار سمبھو" کی صورت میں اگست ۱۹۵۲ء میں ظاہر ہوا۔ میں آپ کی جملہ تصانیف میں اسے ہر اعتبار سے افضل قرار دیتا ہوں۔ ذاں بعد آپ کا "دھمپد" یعنی تلقینات گوتم بدھ کا منظوم ترجمہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کی جانب سے ۱۹۵۴ء میں اور بھگوت گیتا کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

یہ حکایت اگرچہ طویل ہوتی جاتی ہے۔ لیکن دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ آپ نے کچھ حصے زبور اور انجیلِ مقدس کے بھی نظم فرمائے ہیں۔ "رمبھا شک سمباد" کا برجستہ ترجمہ آپ کے مجموعۂ نظم کائناتِ دل میں شامل ہے۔ تلسی داس کی "بنے پتر کا" کا ترجمہ آپ کی قوتِ ترجمہ پر دال ہے۔ گیتانجلی کے ترجمے کا جس قدر حصہ سالنامہ تحریک ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت یہ ترجمہ مکمل ہوگا تو کس درجہ شاندار ہوگا۔ "وجدانِ حافظ" اور "درگا سپت شتی" ہنوز زیرِ پریس ہیں۔ "نذرِ ادب" کے عنوان سے آپ کی چند رباعیات ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھیں، لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم آپ کی غزلیات کا ایک مجموعہ جلد شائع ہو۔ دیکھئے یہ تمنا کب تک بر آتی ہے۔ فی الحال جرمن فلاسفر گیٹھے کے "فاؤسٹ" کا ترجمہ زیرِ تکمیل ہے۔

آپ قادر الکلام شاعر ہیں۔ قطعہ ہو، رباعی ہو، غزل ہو، مثنوی ہو، یا پھر نظم، حتیٰ کہ آزاد نظم ہو، آپ کسی صنفِ سخن میں پیچھے نہیں۔ یہ بات بہت کم سخن وروں کو نصیب ہوتی ہے۔ نثر نگاری میں بھی آپ نے بہت کچھ کمال دکھایا ہے، اور مختلف النوع موضوعات آپ کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

آپ کی طرزِ نگارش سے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ آپ کا ادبی مذاق نہایت ستھرا اور بلند واقع ہوا ہے۔ معیار کی پستی آپ کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ آپ کا

کلام حسنِ اخلاقیات سے مالا مال ہوتا ہے اور اس میں ایک آفاقی اپیل ہوتی ہے۔ پاکیزگی آپ کے کلام کی روح بلکہ جوہرِ اصل ہے۔

خوشی کا مقام ہے کہ کائناتِ دل کی منتخب نظمیں جو پنجاب یونی ورسٹی کے ادیب عالم کے کورس میں شامل ہیں، علیحدہ کتابی صورت میں شائع کی جارہی ہیں۔ اس سلسلے میں کائناتِ دل سے متعلق کچھ مشاہیرِ ادب کی رائیں درج کی جاتی ہیں جن سے طلبار کو کائناتِ دل اور اس کے مصنّف کے بارے میں رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

آنجہانی حضرت علاّمہ کیفی دہلوی

"حضرت منوّر لکھنوی کے کلام میں تخیل بلند، اسلوب کی چستی، بیان کی تازگی اور فکر کی اصابت کی بے شمار نظیریں پائی جاتی ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور نئی ترکیبوں کے استعمال کا ڈھنگ بھی سہانا ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ ان کا مسلک بیان کی شگفتگی اور کلام کی فصاحت ہے۔ نہ سیدھے سادے لفظوں میں بڑی اور کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اُن کے کلام میں اثر ہے کیونکہ وہ دل کی بات منہ سے نکالتے ہیں۔ ان کی کائناتِ دل اسم با مسمّٰی ہے۔ اُن کا تخیل اور پروازِ سخن تصنّع اور تکلّف سے بے لوث ہے۔ بے ساختگی اُن کے کلام کا جوہر ہے۔ مشقِ سخن پختہ ہے۔ اور انھوں نے زمانے کو آنکھیں کھول کر دیکھا ہے۔"

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کے نزدیک حضرتِ منوّر لکھنوی ہمارے بہترین قومی شاعر ہیں۔ آپ کو روشِ ارتقا پسند ہے اور آپ کے وجود کا معیار بلند ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پرانے مضمون میں آپ نیا لطف ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اور نئے مضمون کی تلاش میں دن رات ایک کر ڈالتے ہیں۔ یا نئے استعارے اور نئی تشبیہوں سے گیسوئے مضمون سنوارتے ہیں۔ یا موزونیٔ الفاظ اور ہم آہنگیٔ اصوات سے سادگی کو نظر کشی کی حد تک نکھارتے ہیں۔"

دہلی کے مشہور محبِ وطن ہزایکسیلینسی آصف علی مرحوم کا ارشاد تھا کہ منوّر صاحب کے

کلام میں یہ خوبی ہے کہ سیدھا سادہ ہے۔ مضامین کا میدان بڑا کھلا ہے۔ آپ کے کلام میں وہ باتیں موجود ہیں جو ہر راہگیر زندگی کو روزانہ پیش آتی ہیں۔ مگر انھوں نے انھیں باتوں کو نظم میں قید کر دیا ہے۔"

حضرت امن لکھنوی فرماتے ہیں۔

"شاعری کے جس ماحول میں جناب منور نے پرورش پائی اُس میں زبان کے جوہر بھی تھے اور جذبات کا خزانہ بھی۔ اگرچہ حضرت نظر اور حضرت افق دونوں مُسلّم الثبوت اُستاد تھے، اور دونوں ہی غزل اور نظم کہنے پر قادر تھے، لیکن حضرت نظر کو غزل گوئی میں اور حضرت اُفق کو نظم گوئی میں زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اگرچہ منور کے جوان ہونے سے قبل ہی والد کا سایہ اُن کے سر سے اُٹھ گیا، لیکن چونکہ ان کی طبیعت کو شاعری سے خداداد لگاؤ تھا، اس لئے اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں ہی نگی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا، اور انھوں نے اپنا ابتدائی کلام اپنے والد بزرگوار ہی کو دکھایا۔ والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد حضرت نظر سے اصلاح لینی شروع کی، طبیعت خداداد پائی تھی، مسلّم الثبوت استاد کی شاگردی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ منور کی شاعری کو چار چاند لگ گئے، اور آج اُن کا کلام استادانہ حیثیت رکھتا ہے۔

منور صاحب کے کلام میں صوری و معنوی دونوں قسم کی خوبیاں موجود ہیں۔ پُرانے رنگ کے کہنے والے اُن کے الفاظ کی بندش اور ترکیبوں کی چستی پر داد دیتے ہیں۔ نئے رنگ کے شیدائی اُن کی جذبات نگاری پر وجد کرتے ہیں۔"

روزنامہ ٹربیون، سابق لاہور حال انبالہ

"اس پُرآشوب دور میں جب ہندو مسلمان ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں، حضرت منور لکھنوی جیسے ہندو شعرا کا کلام لبھا غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ منور صاحب

نے ہندو مسلم اتحاد کے ضمن میں قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے زورِ قلم سے منوا لیا ہے کہ اردو اسی طرح خالصتاً مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے جیسے ہندی کو محض ہندوؤں کی زبان قرار دینا غلط ہے۔ کائناتِ دل میں وہ منتخب نظمیں شامل ہیں جنھوں نے آپ کو شہرتِ دوام بخش دی ہے۔ آپ کا اسلوبِ بیان سادہ اور دل کش ہے۔ ہندو دیومالا اور مذاہب سے آپ کو خاص رغبت رہی ہے۔ اس لئے ان موضوعات سے متعلق آپ کی نظمیں خصوصیت سے قابلِ مطالعہ ہیں۔

روزنامہ لیڈر الہ آباد

منشی بشیشور پرشاد منوّر کا نام دلدادگانِ ادبِ اردو کے لئے کوئی اجنبی نام نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ مشہور و ممتاز شاعر مرحوم منشی دوارکا پرشاد اُفق کے صاحبزادے ہیں، بلکہ انھوں نے اپنی قابلیت کے زور سے ہمارے ملک کے صفِ اوّل کے شاعروں میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ منوّر نے بہت بڑی حد تک اپنے ممتاز والد اور ان کے رفیقوں کی روایات اپنی ذات میں جذب کر لی ہیں، اور محض اپنی ہوش مندی سے اس آگ کو قائم رکھا ہے جو اس تحریک کے نئے بانیوں نے روشن کی تھی۔

کتاب زیرِ تبصرہ کے مطالعہ کے بعد ان کو کسی خاص مدرسۂ شاعری سے وابستہ کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان اگرچہ رسمی و روایتی ہے۔ لیکن جو کام انھوں نے کیا ہے اُس کی نوعیت تمام و کمال اپنی مثال نہیں رکھتی۔ زمانۂ قدیم کے اساتذہ کی پیروی کا طریقہ چھوڑ کر وہ روزانہ زندگی کے سادہ سے سادہ واقعات و حوادث سے براہِ راست رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ اپنی فن کارانہ بندشوں نیز شاعرانہ الہام گوئی کی صلاحیتوں سے وہ ان موضوعات کو تابندہ و بوقلموں بنا دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُن کا مقابلہ نظیر اکبر آبادی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ جس نے اپنی

شاعری کے ذریعے میلوں اور تیوہاروں کے راگ گائے ہیں۔ اور ایسی تقاریب کے سلسلے میں زمزمہ پیرائی کی ہے جن کا اثر براہِ راست دل پر پڑتا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ان معنوں میں نظیر کے بمقابلہ ایک جداگانہ حیثیت بھی رکھتے ہیں کہ انھوں نے نظیر کا طرزِ بیان نہیں اختیار کیا ہے۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ منوّر صاحب کا اسلوبِ بیان کسی طرح سے بھی معنی بند، پیچیدہ یا مشکل ہے۔ سادگی منوّر صاحب کے طرزِ بیان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ آئے دن کے معمولی واقعات کا شاعر کے سرچشمۂ تخیل پر فوری اثر ہوتا ہے، اور پڑھنے والے کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ علوِ خیالی کے بلند و بالا طبقے میں طیارے بھر رہا ہے۔ لیکن اس طبقے میں بھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے منوّر صاحب کے کلام سے نغمگی شاذ ہی جدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس سے طبیعت کو مطلوبہ سکون حاصل ہوتا ہے۔

منوّر کی شاعری کی مقبولیت حقیقی مقبولیت ہے، اور اس کا دائرہ وسیع ہے، اسی لیے اردو شاعری کے قدر دانوں کی توجہ اس طرف فی الفور منعطف ہونی چاہیے"۔

کائناتِ دل کے بارے میں مندرجہ بالا چند آرا کا اقتباس ملاحظہ کرنے کے بعد آپ کو یہ امر مسلّمہ نظر آئے گا کہ اردو ادب کے آئندہ مورّخ منوّر صاحب کو اُردو کے محسنوں کی صفِ اوّل میں بجا طور پر جگہ دیں گے۔ اور یہی اُن کا اصل مقام بھی ہے۔

مُسکراہٹ

تمام نورِ علیٰ نور بن رہی ہے یہ
ردائے صبح سے کیا چیز چھن رہی ہے یہ

لبِ اُفق پہ سُنہری لکیر کیسی ہے؟
لکیر میں بھی یہ پروازِ تیر کیسی ہے؟

کلی کلی یہ سراپا نگار کس سے ہے؟
کھنچی چمن میں شبیہِ بہار کس سے ہے؟

یہ موج کس کی ہے دریاؤں کے کناروں میں؟
مہک رہی ہے یہ کیا چیز سبزہ زاروں میں؟

یہ بجلیوں کی تڑپ میں ظہور کس کا ہے؟
یہ بادلوں کی سیاہی میں نُور کس کا ہے؟

رواں ہیں نُور کی لہریں جبیں پہ یہ کس سے؟
چھٹک رہے ہیں ستارے زمیں پہ یہ کس سے؟

یہ کس سے نقشِ محبّت کو رنگ ملتا ہے؟
دلِ حیات کا گہوارہ کس سے ہلتا ہے؟

جھکاؤ شمع کی لَو میں اِدھر اُدھر کیوں ہے؟
لبِ ہلال کی سُرخی یہ چرخ پر کیوں ہے؟

یہ کیوں شگافِ دہانِ صدف پہ دلنت ہے؟
یہ کیوں چمن میں گُلِ زربکف پہ دلنت ہے

یہ کیا ہے ساز سے نغمہ جو بن کے پیدا ہے؟
یہ کیا ہے جو لبِ تصویر سے ہویدا ہے؟

یہ کس کا عکس ہے تلوار کے خم و چم میں؟
ادا یہ کون سی قاتل ہے زلفِ برہم میں؟

یہ تازگی ہے لبِ شیر خوار میں کس سے؟
پڑی ہے جان یہ حُسنِ نگار میں کس سے؟

شفق میں برقِ طپاں کی شرارتیں کیوں ہیں؟
رگوں میں غنچہ و گُل کی حرارتیں کیوں ہیں؟

یہ راز کیا ہے ستاروں کی جگمگاہٹ کا؟
عیاں ہر ایک سے پہلو ہے مسکراہٹ کا

—

نوروز

مردمِ دیدۂ اربابِ یقیں ہے نوروز   پیکرِ سالِ مسیحی کی جبیں ہے نوروز
خاتمِ حلقۂ دوراں کا نگیں ہے نوروز   بڑھ کے ہر روز سے عظمت میں کہیں ہے نوروز

ابنِ مریم کی ہے بیدار نصیبی اس سے
ہیں عیاں جوہرِ تہذیبِ صلیبی اس سے

دمِ عیسیٰ سے ہے وابستہ بہارِ نوروز   قُمْ بِاِذْنی کی صدا پر ہے مدارِ نوروز
ہے کرسمس کی فضا آئینہ دارِ نوروز   کرے کس منہ سے بیاں کوئی وقارِ نوروز

دن یہ دلکش صفتِ عیدِ پسِ عید آیا
باندھنے کے لئے ٹوٹی ہوئی اُمید آیا

صبح میں اس کی صباحت نظر آتی ہے مجھے
اس عبارت میں فصاحت نظر آتی ہے مجھے
شام میں اس کی ملاحت نظر آتی ہے مجھے
اس کے نظارے میں مدحت نظر آتی ہے مجھے

سُرخیٔ سرورقِ بابِ طرب ہے نوروز
کرمِ خاصِ الٰہی کا سبب ہے نوروز

سحر اس کا ہے کہ اعجازِ مسیحائی ہے
خلق آج اس کے مناظر کی تماشائی ہے
گُل فشاں مجمعِ اربابِ کلیسائی ہے
فوج میں اس کی سلامی کو صف آرائی ہے

اس کی عزت ہی سلاطین و گدا دونوں میں
اُٹھتے ہیں دستِ دُعا بہرِ دعا دونوں میں

یہ جو آیا تو مسرت کا زمانہ آیا
ہاتھ اک جشن منانے کا بہانہ آیا
سالِ نو اب کے باندازِ یگانہ آیا
خیر مقدم کو زباں پر یہ ترانہ آیا

شجر این ست کہ گلہائے طرب می بارد
دانشش گوہرِ شہوار فراغت دارد

—

طلوعِ سحر

ایک دنیائے تجلّی ہے نہ بازوئے شب!
بن گیا کافورِ صورت نافۂ آہوئے شب
نُور کے دریا میں لہرانے لگے گیسوئے شب
روئے روشن بن گیا آئینۂ پہلوئے شب

قافلے کا قافلہ گو اب نظر سے دُور ہے
گردِ راہِ ماہ و اختر سے فضا معمور ہے

شاہدِ قدرت کی انگڑائی نے حیراں کر دیا
عالمِ رویا کا شیرازہ پریشاں کر دیا
جلوہ گاہِ شرق کو خورشید عنواں کر دیا
چشمۂ نورِ ازل کو جلبہ ساماں کر دیا

ہر شعاعِ مہر مصروفِ قلم کاری ہوئی
پردہ ہائے چشمِ پرنقوش بیداری ہوئی

ابلقِ ایّام کا کچھ پاؤں ایسا پڑ گیا
ماہِ تاباں کا فلک پر رنگ پھیکا پڑ گیا
مانندِ تنویرِ سحر سے ہر ستارا پڑ گیا
شہپروں پر بازوئے عنقا کا سایا پڑ گیا

خامشی ہے سحر فرما شورِ برق انداز پر
طائرِ خورشید تولے ہے پئے پروانہ پر

نُور جس کا جلوہ گستر گلشن و صحرا میں ہے
نغمہ پردازی کا جس کی غلغلہ دنیا میں ہے
آگ سی جس نے لگا دی چادرِ دریا میں ہے
بھیروی ترشول دستِ نازکِ اوشا میں ہے

وسعتِ ارض و سما میں شان سے استادہ ہے
اس کی نورانی ادا کا اک جہاں دلدادہ ہے

اک سکوتِ جاں فزا ہی مثلِ تصویر آشکار
ہوگئی ذراتِ پنہانی کی تنویر آشکار
شرق سے والشمس کا ہی حُسنِ تحریر آشکار
چہرۂ گیتی پہ ہے رنگِ طباشیر آشکار

رُو نما طوفانِ شب بھر کی خموشی سے ہوا
سرد دریاؤں کا پانی گرم جوشی سے ہوا

کُھل گئی ہے دو دلوں پر رسم و راہِ التفات
خلق نے اندیشۂ رہزن سے پائی ہی نجات
سُرمہ آلودہ تھی رنگِ شب سے چشمِ کائنات
لائی ہے شبنم طہارت کے لئے آبِ حیات

باغِ جنت کی ہوائیں سحر دم کرنے لگیں
اہلِ عالم کی رگوں میں بجلیاں بھرنے لگیں

لہ اوشا، نُور کے تڑکے کی جو دلکش اور خاموش فضا ہوتی ہے سنسکرت کے شعراء نے اُسے اوشا کے نام سے موسوم کیا ہے۔

یہ سماں وہ ہے کہ قائم لطفِ دنیا جس پہ ہے
یہ سماں وہ ہے کہ بنیادِ تمنّا جس پہ ہے

یہ سماں وہ ہے کہ مفتونِ حشم بینا جس پہ ہے
یہ سماں وہ ہے کہ خود خالق بھی شیدا جس پہ ہے

منتخب لمحاتِ یزدانی[1] کا اک حصّہ ہے یہ
جو رقم ہے خطِّ نورانی میں۔ وہ دفتر ہے یہ

اک نشاطِ روح پرور صبح کے منظر میں ہے
اک نئی تحریک کا آغازہ دنیا بھر میں ہے

کس قدر اظہار سرگرمی کا بحر و بر میں ہے
سرِ مہمّ زندگانی ہو یہ سودا سر میں ہے

اس قدر بالیدگی اتنا نمو کا جوش ہے
سبزہ خوابیدہ جو تھا وہ بھی سراپا ہوش ہے

مرد و زن اذنِ نسیم روح پرور سے اُٹھے
کھول دیں آنکھیں ہوئے بیدار بستر سے اُٹھے

پاؤں سبزِ صبح گاہی کیلئے گھر سے اُٹھے
ولولے دل میں طلوعِ مہرِ انور سے اُٹھے

روح کو تسکیں ہوئی حاصل مسرّت چھا گئی
کاروبارِ زندگی میں جانِ تازہ آگئی

---

[1] لمحاتِ یزدانی مراد ہے برمھ مہورت سے۔

طاؤس

ہے شہنشاہ طیورِ عالمِ اسباب تو — اک پرندہ ہے ریاضِ دہر میں نایاب تو
شوکت و جرأت کا آئینہ ہے ہستی تری — طرۂ فائق ہے اس پر شانِ خود مستی تری
تیری ہر خوبی پہ ہے صناعِ قدرت کو دماغ — دیکھ کر گلشن میں تجھ کو ہے طبیعت باغ باغ
کیسی کیسی حدتیں اک مشت میں ہیں عیاں — پیکرِ خاکی میں پیدا کی ہیں کیا رنگینیاں
تیرا ہمتا کوئی تیری شان و شوکت میں نہیں — یہ لباسِ فاخرہ شاہوں کی قسمت میں نہیں
دیکھتا ہر ایک تجھ کو دیدۂ حسرت سے ہے — رعب طاری دل پہ تیری عظمت و شوکت سے ہے
تو ہے دارا منزلت طالع ہے اسکندر ترا — مائلِ تسخیر ہے حسنِ جہاں پرور ترا
ہمسرِ بابر، ہمایوں فال، اکبر مرتبہ — ہے جہانگیری میں تیرا سب سے بڑھ کر مرتبہ
تو ہے اک شاہِ جہانِ حسن و عالمگیر ناز — تجھ کو قدرت نے پرندوں میں کیا ہے سرفراز

زینتِ صحرا بھی ہے تو، رونقِ گلزار بھی — طائروں کا بادشہ سچا ہے، کلغی دار بھی
رنگ کچھ اتنے نکلتے تیرے بال و پر سے ہیں — پر فرشتوں کے بھی جلتے تیرے بال و پر سے ہیں
رشک تجھ سے ہی جہاں میں گلدم و شہباز کو — فخر ہے ہستی پہ تیری عالمِ پرواز کو

تیرے گوناگوں پروں کو دیکھ کر حیراں ہو نہیں
دلفریبی پر تصدق حسن پر قرباں ہو نہیں

ہے نزاکت کچھ ترے بالوں میں ریشم سے سوا
رنگ ہے تیرے پروں کا شوخ نیلم سے سوا

تیرے دلکش پر قبولِ بزمِ سلطانی ہوئے
مورچھل بن کر جو مصروفِ مگس رانی ہوئے

پنکھیاں تیرے پروں کی نازنینوں کو پسند
کلغیاں تیری ہیں چنچل مہ جبینوں کو پسند

تجھ کو حاصل انبساطِ زندگی کا لطف ہے
رقص میں تیرے نشاطِ زندگی کا لطف ہے

دھوم ہر اک گوشۂ عالم میں ہے اس رقص کی
رقصِ فطرت نام ہے جس کا وہ شاید ہے یہی

مست مثلِ رندِ صہبا نوش یوں جنگل میں ہے
جانِ عالم جلوہ گر گویا اس مشغل میں ہے

رقص میں پایا نہ اب تک حور و غلماں نے تجھے
منزلت دی اپنی شادی کی انساں نے تجھے

ایک طائر اور انساں میں یہ رسمِ ارتباط
رقصِ طاؤسی ہے بابِ مشقِ اربابِ نشاط

کیوں مشرف ہے بشر دنیائے موجودات میں
اک وجودِ غیر کا ممنون ہے ہر بات میں

ہے ترا مسعود منظر اک شگون اچھا ہے تو
دیدۂ ہندو میں باہن[1] سرسوتی جی کا ہے تو

کس قدر عزت تری کا شانۂ ایماں میں ہے
منزلت حاصل پرِ منقوش کو قرآں میں ہے

میں نے کھینچا ہے مرقع آج کاغذ پر ترا
چشمِ دل میں پھر رہا تھا رقصِ جاں پرور ترا

[1] باہن یعنی سواری

اَبر و باراںؔ

جامنی رنگ کا مشرق سے اُٹھا ہی بادل
دیدۂ چرخ میں یا پھیل گیا ہے کاجل

مست ہاتھی چلے آتے ہیں یہ باندھے بادل
آبنوسی یہ بنا ہے کوئی گردوں پہ محل

مرغِ آبی کہیں کس طرح کہ بے پر ہے یہ
ایک اُڑتا ہوا پانی کا سمندر ہے یہ

کوہ سُرمے کا ہے یہ اوج ہوا پر کوئی
یا ہے بھیگے ہوئے کاغذ پہ سیاہی پھیلی

انجمن ایک یہ گویا ہے رواں بھونروں کی
یا ہے اک دیو صفت ریچھ کی تصویر بنی

اہلِ دنیا کی جہالت کا سویدا ہے یہ
یا کسی دیدۂ پُر آب کا چربا ہے یہ

کسی بدمست کے ہاتھوں سے یہ بکھری ہے مسی
یا لپکتی ہے یہ ناگن کوئی کالی کالی
آہ نکلی ہے دھواں بن کے کسی کے دل کی
کسی رنجور کے تن پر ہے یہ پوشاکِ غمی

بحرِ اسود سے یہ اک موج چلی آتی ہے
حبشیوں کی یہ کوئی فوج چلی آتی ہے

وسعت انگیز کسی کا ہے یہ قلبِ مایوس
ہے سیاہی میں رنگا پردۂ ننگ و ناموس
مائلِ رقص ہے پھیلا کے پَرِ دلسا کو طاؤس
چہ ظلمات ہے یا اوجِ فلک پر معکوس

کامنی بال یہ اپنے کوئی پھیلائے ہے
نازنیں اک دلِ مہجور کو اُلجھائے ہے

بھر گیا ہو جو دھوئیں سے وہ غبارہ ہے یہ
راکھ بن کر جو اُڑا ہو وہ شرارہ ہے یہ
مضطرب طشتری چرخ میں پارہ ہے یہ
یا گنہگار کوئی محوِ کفارہ ہے یہ

صبح کاذب کا اسے آپ سپیدہ کہیے
یا سیہ فام اک آہوئے رمیدہ کہیے

لاکھ اظہارِ کمالات میں توڑا ہے قلم
ان تشابیہہ کے پردے میں ہے اک پہلوئے ذم
ابر ہے یہ نہ کسی حُور کی زُلفِ پُرخم
ماتمی ہے نہ حکومت کا یہ شاہی پرچم

کرشن کی موہنی مورت کا مرقّع ہے یہ

سانولے شام کی صورت کا مرقّع ہے یہ

بال گوپال کی شوخی کی جھلک ہی اِس میں

کرشن کے حُسنِ دلآرا کا نمک ہے اِس میں

خیرہ آنکھیں ہیں کچھ اس درجہ چمک ہی اس میں

کہ نہاں تابشِ خورشیدِ فلک ہے اِس میں

ایک اس ابر سے ٹھنڈک ہے ہزار آنکھوں میں

جلوہ گر ہو گئی دواپر[1] کی بہار آنکھوں میں

---

[1] دواپر، ہندوؤں کی تقسیم زمانہ کے لحاظ سے ایک دورِ عظیم کا نام۔ جس میں بھگوان کرشن کا اوتار ہوا تھا۔ باقی ادوار کے نام مشہور ہیں یعنی ست جگ، ترتیا اور کلجگ۔

شاعر کا دل

نہ کیوں شاعر کا دل ہم مرتبہ ہو ماہ تاباں کا
کہ اس میں موجزن ہے اک سمندر آبِ حیواں کا
اگر رکھتا دلِ شاعر کی دنیا میں قدم اپنا
سکندر کو نہ ہوتا رنج ہرگز خونِ ارماں کا
یہ دل اک مسکنِ آزادیٔ و عیشِ دوامی ہے
یہی ہے عشق کا منبع یہی مصدر ہے عرفاں کا
عروسِ فکر سے اٹھکھیلیوں میں محو رہتا ہے
پھرا کرتا ہے منظر اس کی آنکھوں میں شبستاں کا
اسی سے عشق کے جذبات میں ہیں گرمیاں پیدا
بڑا ہے مرتبہ اس کی بدولت ماہِ تاباں کا

دلِ شاعر کا ہے اک قطرۂ خوں شعرِ پُر معنیٰ
یہ اک دلچسپ مجموعہ ہے اجزائے پریشاں کا
کبھی اُڑتا ہے یہ ہمراہ پروانے کے محفل میں
کبھی جل بھُن کے بن جاتا ہے جزو اک شمع سوزاں کا
کبھی اس میں نظر آتی ہے رنگینی گلستاں کی
کبھی گوشہ یہ بن جاتا ہے اک صحرائے وِیراں کا
غرض اس دل کی ہستی بھی عجب پُر لطف ہستی ہے
تموّج خاصیت اس کی ہے فطرت اس کی مستی ہے
یہ وہ دل ہے کہ ٹکڑے آسماں پر جس کے تاباں ہیں
زمیں پر اس کے ذرّاتِ تجلّی خیز رقصاں ہیں
یہ وہ دل ہے جسے اہلِ نظر سے داد ملتی ہے
فرشتے عرشِ اعظم پر اسی دل کے ثنا خواں ہیں
یہ وہ دل ہے مسیحا کے بھی دل میں درد ہے جس کا
یہ وہ دل ہے تصدق جس کے استغنا پہ سلطاں ہیں

اسی دل کی بدولت مذہبوں میں جان باقی ہے
اسی کے تارِ رگ سے منسلک اجزائے ایماں ہیں

یہی وہ دل ہے بزمِ مطربانہ جس سے پیدا ہے
اسی دل کے ترانے سازکے پردوں میں پنہاں ہیں

اسی دل سے ہوا ہے ہیبت افزا جنگ کا نعرہ
اسی کے دبدبے سے رستم و سہراب لرزاں ہیں

اثر میں ڈوب کر اشعار نکلے ہیں جو اس دل سے
سناں ہیں تیغِ تابشناک ہیں تیر و پیکاں ہیں

جنھیں کہتے ہو تم شاعر پیمبر ہیں وہ قدرت کے
انھیں فوق البشر سمجھو جو قدرت سے سخنداں ہیں

حقیقت آشکارا ان پہ ہے امروز و فردا کی
تجلّی اُن کے سینے میں نہاں ہے طورِ سینا کی

منوّر مجھ کو اپنے دل پہ دائم ناز رہتا ہے
کہ یہ سازِ نفس پر زمزمہ پرداز رہتا ہے

گزرتے ہیں مرے ایّام اک مستی کے عالم میں!

مرا دل چپکے چپکے مائلِ اعجاز رہتا ہے
سفر میں اپنے دل کو میں عدم سے ساتھ لایا ہوں

یہی ہر وقت میرا ہمدم و ہمراز رہتا ہے
کبھی غفلت نہیں ہوتی سماعِ کوس رخصت میں

ہمیشہ کُوچ کو یہ گوش بر آواز رہتا ہے
نہیں لگتی نہیں لگتی ہوا اس کو زمانے کی

ریا سے دُور تر آزادِ حرص و آز رہتا ہے
فرشتے بھی جہاں اُڑنے کو جنت میں ترستے ہیں

وہاں بے بازو و پر مائلِ پرواز رہتا ہے
یہ بُت خانہ بھی ہے، کعبہ بھی اس کو لوگ کہتے ہیں

در اس کا مومن و کافر پہ یکساں باز رہتا ہے
نہیں حالانکہ میں شاعر مگر یہ دل بنادے گا
مجھے یہ شعر کا اک عاشقِ کامل بنادے گا

حِنا

رہا نہ راز جو تھا رازِ سبز باغِ حنا
مشامِ جاں میں ہوا منتقل دماغِ حنا
نظر نوازِ مہ و خور ہے رنگِ داغِ حنا
بساطِ حسن میں لَو دے اُٹھا چراغِ حنا
ریاضِ دوست کھلا دعوتِ نظر کے لئے
پیامِ عیش ملا فرحتِ جگر کے لئے

شرارِ آتشِ گل دستِ نازنیں میں نہیں
شکارِ مرغِ حنا پنجۂ حسیں میں نہیں
یہ رنگِ خونِ وفا دیدۂ یقیں میں نہیں
جگہ کہیں بھی اسے چشمِ عیب بیں میں نہیں
چڑھا ہے رنگِ عمل اشتیاقِ تزئیں پر!
مہک رہا ہے گلستاں کفِ نگاریں پر!

نگاہِ ناز ہوئی منزلت فزائے حنا   شفق فلک پہ نہیں ہے یہ فرشِ پائے حنا
نشانِ سرخ میں ہے شوخیٔ ادائے حنا   اس آئینے سے ہوئی آئینہ بہائے حنا

یہ ہے وہ نقش جو تصویرِ سوز و ساز نہیں
ہے جاں نواز اثر ہیں یہ جاں گداز نہیں

وفا شناس نہ ہو قدرِ دوستی نہ کرے   تمنائے برگِ حنا خواہ آدمی نہ کرے
بنا کے چور اسے بے وقار بھی نہ کرے   یہ بے خطا ہے اسے متہم کبھی نہ کرے

وفا کا رنگ نقوشِ جفا میں بھرتی ہے
یہ رُوح اپنی حسینوں کو نذر کرتی ہے

چراغ بن کے یہ روشن ہے دستِ رعنا میں   تجلّیٔ مہِ نو اس سے ہے کفِ پا میں
عجیب چیز حنا بھی ہے باغِ دنیا میں   طراوت اس سے ہے پیدا دلِ مسیحا میں

اسی کا رنگ نمایاں جمال میں دیکھا
کسی حسیں کو جہاں برشگال میں دیکھا

انسانی قالب

ہے بشر عقل تری لائقِ تبدیل، بدل
اپنے ماحول کی ترکیب کے اجزا کو سنبھال
آشکارا ہی نہیں تجھ پہ حقیقت اپنی!
آج تک تو نے جو سمجھا ہے غلط سمجھا ہے
تیری ہستی نہیں تحقیر کے قابل ہرگز
عارضی گرچہ زمانے میں ہے قالب تیرا
نظر آتی ہی نہیں اس میں کثافت مجھ کو
میں نے سرتا بقدم اس کو مُنوّر پایا
اس میں اک نُور کی دنیا نظر آتی ہے مجھے

چھوڑ فرسودہ عقائد، رُخِ تخئیل بدل
اپنے حالات کی بگڑی ہوئی دنیا کو سنبھال
دیکھ آئینۂ شفّاف میں صورت اپنی
خود کو اک خاک کا پُتلا ہی فقط سمجھا ہے
کہ نہیں کوئی بھی شے اس کے مقابل ہرگز
ہے مگر کیفِ نہاں عنصرِ غالب تیرا
مست رکھتی ہے مدام اس کی لطافت مجھ کو
مہ و خورشید سے بھی اس کا ہے برتر پایا
ہر رگ و پے میں تجلّی نظر آتی ہے مجھے

جو ہے بخشندۂ کُل اک ہے یہ سوغات اس کی — نظر آئے گی تجھے اس میں کرامات اُس کی

جزو اک عالمِ امکاں کا نمایاں ہے یہ — سلکِ تخلیق کا اِک گوہرِ غلطاں ہے یہ

منزلت اس کی ہمیشہ تجھے لازم ہے عزیز — ڈیڑھ دو گز کا یہ ڈھانچہ ہی بڑے کام کی چیز

یہی کعبہ یہی گرجا ہے یہی ہے مندر — کسی معبد سے بھی رُتبہ نہیں اس کا کمتر

غور سے دیکھ اگر وا ہے تری چشمِ یقیں! — مزرعہ تخمِ عمل اس کے سوا اور نہیں

جہدِ ہستی کے لئے ہی یہی میدان مصاف — جو نہیں یہ تو کہیں بھی نہیں امکانِ مصاف

تجھے اس رازِ نہانی کی خبر خاک نہیں — جسمِ خاکی یہ فقط تیری ہی املاک نہیں

اقتدار اس پہ کچھ ارکانِ وطن کا بھی ہے — اختیار اس پہ کچھ ابنائے زمن کا بھی ہے

جس سے چڑھتے ہیں سرِ بام وہ زینہ ہی یہی — پار اُتر سکتے ہیں جس سے وہ سفینہ ہی یہی

گھر یہ اللہ کا ہے اس کی حفاظت کرنا
کُفر ہے قالبِ خاکی کی مذمّت کرنا

رُکمنی اور کرشن

یہ کون نازنینِ سُبک پا صبا خرام
جُنباں برنگِ شاخِ گُل افشاں چمن میں ہے

قامت میں اپنے حُسنِ خم و چم لیے شکستِ تیغ
ہے وجہ خونِ دل جو شکن پیرہن میں ہے

رنگِ شباب زینتِ چشمِ عدوئے ہوش
جوشِ شراب، ساغرِ توبہ شکن میں ہے

ہے شاہدِ نزاکتِ اندامِ دل رُبا
ہلکا سا جوشِ خوں وہ جو رگ ہائے تن میں ہے

کچھ سعیٔ ضبطِ موجِ تبسّم لبوں پہ کچھ
شایاں غضب کا رنگِ خموشی دہن میں ہے

ہے اختیار و ضبط کی اُلجھن میں جذبۂ شوق
منصور یا کشاکشِ دار و رسن میں ہے

دل لے چلا ہے مرکزِ ارماں کو اپنے ساتھ
یہ نسبتِ لطیف کہاں جان و تن میں ہے؟

سینے میں دل رہینِ خیالِ وفا نہیں
ہے اک گرہ جو رشتۂ عہدِ کہن میں ہے

آنکھیں بتا رہی ہیں دلِ مضطرب کا حال
سوزاں برنگِ شمع کسی کی لگن میں ہے

جُھرمُٹ سہیلیوں کا چپ و راس جلوہ گر
اک جانِ انجمن ہے جو اس انجمن میں ہے

پردے میں شوق کے ہمہ تن اضطراب ہے
کس کے خرام میں روشِ ماہتاب ہے؟

قربانِ حسنِ جانِ دو عالم یہ کون ہے؟ کس کی نظر میں جلوۂ رعنا ہے کرشن کا؟
پیدا بیاضِ رُخ سے تجلّی ہے کرشن کی آئینہ خالِ رُخ میں ہویدا ہے کرشن کا؟
نیچی نظر ہیں کون چھپائے ہے کرشن کو؟ کس کا حجابِ ناز یہ پردا ہے کرشن کا؟
ڈالی ہے کس نے جانِ جہانِ جمال پر؟ کس کی ادا سے حسن دوبالا ہے کرشن کا؟
دامن میں اپنے چاند ہزاروں لئے ہوئے کس کی جبیں پہ نقشِ کفِ پا ہے کرشن کا؟
ہمرنگِ عشق و حُسن ہیں کس کے طلسم سے؟ سائے میں کس کی زلف کے سایا ہے کرشن کا؟
کس نے کیا ہی جادوئے تسخیر کرشن پر؟ کس کی زباں پہ ذکرِ دل افزا ہے کرشن کا؟
ہے یہ وہ نازنیں جسے کہتے ہیں رُکمنی جس کو جنوں ہے کرشن کا سودا ہے کرشن کا؟
رکھیں گے آکے لاج وہی اس پریم کی بیچارگی میں دل کو سہارا ہے کرشن کا؟
جاتی ہے اشٹ دیو کی پوجا کو رکمنی آنکھوں سے انتظار ٹپکتا ہے کرشن کا؟

اُٹھ کر رہے گی چشمِ زدن میں نگاہِ کرشن
مِل جائے گی اسے کوئی دم میں پناہِ کرشن

ترغیبِ ارتقا

سپردِ حُسنِ ازل مائلِ بقا ہو جا   فنا و عشق کی تکمیل میں فنا ہو جا
وفا سرشت ہو تیری وفا کا بندہ بن   گلہ جفا کا نہ کر کشتۂ جفا ہو جا
ہے ابتدا ہی سے غفلت جو انتہا کی تجھے   کر ابتدا وہ اب اپنی کہ انتہا ہو جا
گزر خودی سے کہ ہو کیفِ بیخودی حاصل   خدا نہیں تو کبھی اے بندۂ خدا ہو جا
جو کہہ رہا ہوں کہ تو غیر کی تلاش نہ کر   یہ مدعا ہے کہ اپنا ہی مدعا ہو جا
اسی سے نیستی بیگانگی کی ممکن ہے   کہ اپنے جوہرِ ہستی سے آشنا ہو جا
ہر آئینہ ہے ترا دل ہی سرِ خود مستی   اس آئینے میں جِلا کر کے خودنما ہو جا

یہی ہے فتحِ حقیقت، یہی شکستِ مجاز
کہ اپنے حسنِ نہانی پہ خود فدا ہو جا

رسائی ہے جو تری صرفِ نارسائی تک
تو نارسائی کے اقرار سے رسا ہو جا

رہے مدام نظر تیری اپنے مرکز پر
محیطِ دائرۂ طاعت و رضا ہو جا

نہاں نشاطِ دوامی کا راز اسی میں ہے
جو دل کے ساز سے پیدا ہو وہ صدا ہو جا

بہت لیا ہے منوّر زبانِ قال سے کام
زبانِ حال سے بھی اب سخن سرا ہو جا

—

بجلی کی روشنی اور پروانہ

(ایک منظر دیکھ کر)

یہ عشق بے مزہ اے پروانہ کس لئے ہے؟
عقل و خرد سے اتنا بیگانہ کس لئے ہے؟

کیوں بے قرار ہو کر ناحق لپک رہا ہے؟
شیشے کے قمقمے پر کیوں سر پٹک رہا ہے؟

کیوں جوشِ عاشقی میں ہر شے سے بے خبر ہے؟
محفل نہیں یہ کوئی اک عام رہگزر ہے

ناکام ہی رہے گا یہ اشتیاق تیرا
غافل! اڑا رہی ہے دنیا مذاق تیرا

اس رہگزر میں تیرا ہمدم نہیں کوئی بھی
فریادِ بے زباں سے محرم نہیں کوئی بھی

ممکن نہیں کہ نکلے ارمان تیرے جی کا
کیوں خون کر رہا ہے ناموسِ عاشقی کا؟

شیشے کے قمقمے کو تو دیکھتا نہیں کیا؟
ذوقِ نظارہ تجھ میں باقی ذرا نہیں کیا؟

اِس قمقمے کے اندر شعلہ سا ہے جو نہاں — اس میں نہیں ذرا بھی اوصافِ شمع سوزاں

ہے اس کی روشنی کا کچھ اور ہی قرینہ — ہستی ہے اس کی دائم محتاجِ آبگینہ

اندر جو قمقمے کے پردہ نشیں نہ ہوتی — بجلی کی روشنی یہ ظاہر کہیں نہ ہوتی

سر پھوڑ کر یہ مانا پردے کو دُور کر دے — شیشے کا قمقمہ یہ تو چُور چُور کر دے

بے پردگی کی حالت مانا کہ یہ ہوئی بھی — باقی نہیں رہے گی لیکن یہ روشنی بھی

پُورا کبھی نہ ہوگا شوقِ وصال تیرا — تجھ کو ستا رہا ہے ناحق خیال تیرا

اندر بھی جا کے دامن ارماں کا چاک ہوگا — باہر سے بھی میسّر تجھ کو نہ خاک ہوگا

ہے کچھ خبر تجھے دل کس کے لئے مِلا ہے
اُس کے لئے مِلا ہے جس کے لئے مِلا ہے

سُورج مکھی کا پھُول

سُورج مکھی کا پھُول شگفتہ چمن میں ہے
یا شمع جلوہ پاش کسی انجمن میں ہے

رنگیں بھی خوش ادا بھی ہے ناز آفریں بھی ہے
نازک بھی دلنواز بھی ہے یہ حسیں بھی ہے

پیدا جو اس میں بات ہے سورج کہاں سے لائے
یہ آن بان اور یہ سج دھج کہاں سے لائے

دیکھو تو جلوہ پاش یہ کس شدّ و مد سے ہے
سوزاں فلک پہ مہرِ مبیں بھی حسد سے ہے

قدرت نے اپنی شان دکھائی اسی میں ہے
برقِ طپاں سمٹ کے سمائی اسی میں ہے

نام اس کا لے اُڑے ہیں حسینانِ مہ جبیں
جو اس میں وصف ہے وہ کسی پھُول میں نہیں

بختِ چمن کا اخترِ تاباں یہی تو ہے
پھُولوں کی انجمن میں نمایاں یہی تو ہے

بیٹھا ہے اک رئیسِ جمال بخت شان سے
خورشید تک رہا ہے اسے آسمان سے

مخزن ہے تازگی کا لطافت کی کان ہے
سچ پوچھیے اگر تو گلستاں کی جان ہے

آنکھوں میں نور رنگِ لطافت اثر سے ہو
دل کو سرورِ حسنِ صباحت اثر سے ہے

ہر برگِ زرد اک ہے کرن آفتاب کی
لیکن نہیں ہے اس میں جلن آفتاب کی

ہر وقت کاش پھول یہ مدِ نظر رہے
سرمایہ بخشِ فرحتِ قلب و جگر رہے

جب نام ہی میں اس کے کشش انتہا کی ہے
حیرت ہو کیوں جو اس میں شرارت بلا کی ہے

سامان یہی چمن میں مری دل کشی کا ہے
پھولوں میں پھول اگر ہے تو سورج مکھی کا ہے

عجائب خانۂ دُنیا

ہے کسی کے تجربے میں اک خراب آباد یہ
جس طرف اُٹھی نظر دیکھا کہ اک ویرانہ ہے

ہے نظر میں یہ کسی کی اک سرائے کارواں
جس میں ہر رہروِ سفر باہم دگر بیگانہ ہے

کوئی کہتا ہے کہ یہ اک مجلسِ تاریک ہے
جس کا ہر ساکن جنوں پروردہ ہی دیوانہ ہے

ہے کسی کا قول یہ اک آئینہ قدرت کا ہے
جس کا عنواں حیرت افزا ہی یہ وہ افسانہ ہے

اس میں اُس کو بیوفائی شمع کی آئی نظر
جس کی قسمت میں ازل سے حسرتِ پروانہ ہے

ہے کسی مستِ مئے عرفاں کی یہ موجِ خیال
بادۂ نیرنگ سے لبریز اک پیمانہ ہے

ہے نگاہِ عشق میں یہ اک تماشا گاہِ حسن
ہر طرف جس میں نمایاں جلوۂ جانانہ ہے

اور دعویٰ ہے بجا یہ بھی کسی دیندار کا
اہلِ ایماں کی ریاضت کو یہ اک کاشانہ ہے

زاہدوں کے واسطے ہے اک یہ جولانگاہِ زہد
اور رندوں کے لئے اک محفلِ رندانہ ہے

کچھ بھی ہو دُنیا منوّر دوسروں کے واسطے
میری نظروں میں مگر یہ اک عجائب خانہ ہے

جوہرِ ایثار

جو زخمِ دگر سے جگر افگار نہیں ہے
جو رنج سے دنیا کے خبردار نہیں ہے
جو راہروِ جادۂ ایثار نہیں ہے
شانِ بشریت کا سزاوار نہیں ہے

کیا خاک ہو بندہ کبھی پیارا وہ خدا کا
بندہ جو نہیں جذبۂ ایثار و وفا کا

پڑ جائے اگر دردبھری کان میں آواز
دے غم جو کسی کو فلکِ شعبدہ پرداز
چہرے سے نمایاں ہوں جہاں کرب کے انداز
ہو جائے عیاں جذبۂ ایثار کا انداز

پانی کی جگہ زخم کے دھونے کو لہو دے
ڈورے کی جگہ ہر رگِ تن بہرِ رفو دے

دل کوئی اگر سوزشِ پنہاں سے تپاں ہو
دکھیا جو کوئی مائلِ فریاد و فغاں ہو
بیوہ جو کوئی مضطربِ دردِ نہاں ہو
تنگ اپنی یتیمی سے جو اک ننھی سی جاں ہو

بیکس پہ امداد اگر کوئی صدا دے
اک آگ سی ایثار کلیجے میں لگا دے

بیچین کرے غیر کی تکلیف کا احساس
پائے وہ تشفی جو ہو سرگشتۂ افلاس
دے بن کے مسیحا اُسے درمانِ غم و یاس
بے آس جو ہو جائے کوئی اس کی بنے آس
ایثار یہ ہے تار سے اپنی رگِ جاں کے
زخمِ تنِ مجروح کو خود بیٹھ کے ٹانکے

ہو کوئی گرفتار اگر دامِ بلا میں
اُٹھ جائے قدم جادۂ ایثار و وفا میں
ہوتی ہے فنا ذات کی تبدیل بقا میں
مقبول یہ ایثار ہے درگاہِ خدا میں
باطن میں فرشتہ ہو تو ظاہر میں بشر ہو
ہر بات میں بہبودِ خلائق پہ نظر ہو

ہو شرکتِ ہمسایۂ محزوں دل و جاں سے
دو حرف تسلی کے نکل جائیں زباں سے
بن کر رگِ تاثیر لپٹ جائیں فغاں سے
دُنیا کو سُبک دوش کریں رنجِ گراں سے
واقف ہو غمِ خویش سے دُکھ غیر کا جانے
اس واسطے بخشا ہے دل انساں کو خدا نے

تاثیرِ سحر

(رُباعیات)

ہوتی ہے نگاہ و دل کی سیری اِس وقت
کرتی ہے صعود رُوح میری اِس وقت
خود ہی یارب نہ جانے کیسے ہر روز
آنے لگتی ہے یاد تیری اِس وقت

تہ میں اس کی فراغ بالی بھی ہے
حرکت یہ رگوں کو دینے والی بھی ہے
ہے صبح صبیح کی منوّر کیا بات
اک ساتھ جمالی بھی جلالی بھی ہے

ہم رنگ عروسِ نَو یہ شرماتی ہیں
پہلوئے سحر کو گو یہ گرماتی ہیں
ہر سمت بکھیر کر تبسم اپنا
کرنیں سُورج کی دل کو برماتی ہیں

خورشید نے چھیڑا ہے کوئی سازِ عجیب
اس کے پردے میں ہے اک آوازِ عجیب
نغمے ہیں جگر سوز یہ گویا پیدا
کرنوں کے چھٹکنے کا ہے اندازِ عجیب

کسبِ کمال اور طولِ عمر

حاصل ہے میرے دل میں جگہ اس خیال کو
کچھ ضد ہے طولِ عمر سے کسبِ کمال کو!

تعجیل سے جہاں بھی ہے تکمیلِ رنگ و بُو
ہے قطع درمیاں سے وہیں رشتۂ نمو

جلتے ہی جب چراغ کے شعلہ بھڑک اُٹھا
افسردگی سے جلد اُسے سامنا ہوا

قطرہ وہ جس میں شورشِ دریا کا ہے ظہور
ہوتا ہے جلد چشمِ جہاں سے نہاں ضرور

دعوئے عام گو مری تحریر میں نہیں
لیکن ہے واقعات سے یہ قابلِ یقیں

آگاہیِ کمالِ سکندر کسے نہیں؟
حیرت اثر مآلِ سکندر کسے نہیں؟
جلد اُس کو باغِ دہر سے مُنہ موڑنا پڑا
رشتہ جو زندگی سے تھا وہ توڑنا پڑا

ادّویت[1] وادیوں کا وہ سرتاج بےمثال
وحدت کے فلسفے میں تھا حاصل جسے کمال
شنکر جو متّصف تھا ہزاروں صفات سے
محروم قدرتاً تھا وہ طولِ حیات سے

عُرفی کہ بزمِ شعرِ عجم کا چراغ تھا
اس پھول سے بہار پہ ایراں کا باغ تھا
جس وقت نیند آئی اُسی وقت سوگیا
خاموش خاص عہدِ جوانی میں ہوگیا

---

[1] ادّویت وادی یعنی مُوجد مت سوامی شنکراچارج

انگلینڈ کا سخنور مشہور جان کیٹس

وہ بادشاہِ مُلکِ سخن نوجوان کیٹس
عہدِ شباب ہی میں جہاں سے گزر گیا
یہ باکمال وقت سے پہلے ہی مر گیا

وہ لکھنؤ کا شاعرِ معجز بیاں نسیم
فخرِ زمان و نازشِ ہندوستاں نسیم
ہے مثنوی اک آئینہ جس کے کمال کا
اُس کو بھی جلد حکم ملا انتقال کا

درگا سہائے ساقیِ خم خانۂ سُرور
کھاتے کچھ اور روز ہوائے جہاں غُرور
لیکن کمالِ فن کی بدولت نہ جی سکے
جی بھر کے جامِ بادۂ ہستی نہ پی سکے

وہ روحِ پاک شمعِ شبستانِ معرفت
وہ رامؔ بادشاہِ دُرِ کانِ معرفت!
کس سِن میں غرقِ بحرِ فنا، آہ ہو گئے
دُنیا سے کتنی جلد جُدا، آہ ہو گئے

آخر کرے گا کوئی کہاں تک شمار اور
ایسی ملیں گی ہم کو مثالیں ہزار اور
لیکن مجھے بھی دل سے یہی ہے پسند بات
بیکار ہے طوالتِ افسانۂ حیات
جب مقصدِ حیات کی تکمیل ہو گئی
منشائے کائنات کی تکمیل ہو گئی
پھر باغِ زندگی میں سکونت فضول ہے
پھر قیدِ عنصری کی اذیت فضول ہے
ہوں کاش میں بھی شادِ حصولِ کمال سے
وابستہ سعی ہو مری حُسنِ مآل سے
کچھ غم نہیں اگر میں زیادہ نہ جی سکوں
لیکن مئے کمالِ سخن چھک کے پی سکوں
مجھ کو ذرا خیال نہیں سِنّ و سال کا
چھوڑوں گا کچھ تو نقش جہاں میں کمال کا
لیکن یہ اپنے بس کی منوّر نہیں ہے بات
ہیں سنگِ راہِ شوق ابھی تک مقدّرات

کاسنی کا پھول

نظر فریب و دل آویز کاسنی کا یہ پھول
ہے کس قدر طرب انگیز کاسنی کا یہ پھول

ہزار دل سے تصدّق ہیں خوش ادائی پر
ہزار جان سے قرباں ہیں دلربائی پر

شرارتیں ہیں عیاں اس سے مہ جبینوں کی
کہاں سے طرز اُڑالی ہے نازنینوں کی

یہ گُل ہے یا کوئی حسن و جمال کا پیکر
کہ رنگِ شوخ سے ہے وجہ خیرگیٔ نظر

اسی کو دیکھ کے ہر لب پہ مُسکراہٹ ہے
اسی کے دم سے گلستاں میں جگمگاہٹ ہے

حسین شوخ دل افروز جانفزا ایسا
نہیں چمن میں کوئی پھول خوشنما ایسا

بہارِ باغ کا اک ترجمان پھول ہے یہ
لطافت اور نزاکت کی جان پھول ہے یہ

قیامتیں ہیں نہاں حُسنِ رُوح پرور میں
ہے اس کو دیکھ کے سُورج مُکھی بھی چکر میں

ہے اس کے سامنے اس درجہ رنگِ رُخ پھیکا
سر اُٹھ سکا نہ خجالت سے لاجونتی کا

گلاب میں نہیں جوہی میں کیتکی میں نہیں
جو اس کے رنگ میں شوخی ہے وہ کسی میں نہیں

نہیں یہ گُل ہے مئے نیلگوں کا ساغر ہے
سرور بخش نظر ہے حیات پرور ہے

گُماں ہے کوئی حسینہ پئے ستمگاری
پہن کے آئی ہے گلشن میں نیلگوں ساری

بدل کے بھیس فلک بوستاں میں آیا ہے
سمٹ کے پھول کے قالب میں جلوہ پیرا ہے

کرے نہ ہم پہ عیاں نیلم اپنے جوہر کو
کہ پھول چھوڑ کے لیتا ہے کون پتھر کو

مقابلے کی اگر تاب کاسنی سے کرے
قبول اسکی غلامی بڑی خوشی سے کرے

وجود اِس کا فقط ہے چمن کی تزئیں کو
چھوئے جو اس کو تو رعشہ ہو دستِ گلچیں کو

یہی ہے رُوحِ چمن ہاں یہی ہے جانِ چمن
اِسی کے حُسنِ دلاویز سے ہے شانِ چمن

جو اک نگاہ بھی رنگ اِس کا دیکھ لیتا ہے
کمالِ صانعِ قدرت کی داد دیتا ہے

ہے یوں تو معجزہ ہر ایک بے مثال اِس کا
ہے ختم کاسنی کے پھول پر کمال اِس کا

میں کیا ہوں؟

وہ مومن ہوں جو مرتا ہے نگاہِ کفر ساماں پر
وہ منکر ہوں جو عاشق ہے جمالِ رُوحِ قرآں پر
وہ عاشق ہوں غذائے رُوح جس کو غم سے ملتی ہے
وہ مجنوں ہوں بسر کرتا ہے جو ریگِ بیاباں پر
وہ میکش ہوں مئے کوثر گری ہے جس کی نظروں سے
وہ زاہد ہوں نگہ رکھتا ہے جو صہبائے عرفاں پر
وہ ساغر ہوں جو اپنی گردشوں میں محو رہتا ہے
وہ صہبا ہوں برستی ہے جو پیہم بزمِ رنداں پر
وہ قاتل ہوں خود اپنے قتل کا الزام جس پر ہے
وہ بسمل ہوں تڑپ پیدا ہے جس میں خونِ ارماں پر
وہ کانٹا ہوں سبق دیتا ہے جو تکلیفِ صحرا کا
وہ غنچہ ہوں تبسم ریز ہے جو رنگِ بستاں پر

وہ صحرا ہوں جسے گلہائے خنداں سے تعلق ہے
وہ گلشن ہوں جو نکہت بار ہے خارِ مغیلاں پر

وہ دریا ہوں روانی ہے ازل سے خاصہ جس کا
وہ ساحل ہوں جو چپ رہتا ہے اکثر شورِ طوفاں پر

وہ خرمن ہوں بڑھی ہے جس سے عظمت دانے دانے کی
وہ بجلی ہوں جو صیقل کر رہی ہے ابرِ باراں پر!

وہ کنعاں ہوں چھپا کر جس نے رکھا حسنِ یوسف کو!
وہ یوسف ہوں جسے ہے ناز قیدِ چاہِ کنعاں پر

وہ مسجد ہوں جو کفر و شرک کی عظمت کا نقشہ ہے
وہ مندر ہوں بنا قائم ہے جس کی دین و ایماں پر

وہ اخگر ہوں جسے انکار ہے آتش فروزی سے
وہ شعلہ ہوں تڑپتا ہے جو ذکرِ قلبِ سوزاں پر

وہ آنسو ہوں جو دامن سے گرا ہے ابرِ نیساں کے
وہ موتی ہوں کہ آب آئی ہے جس سے چشمِ گریاں پر

وہ رشتہ ہوں دلِ اہلِ جہاں ہیں منسلک جس میں
وہ سوزن ہوں جو مائل ہے رفوئے چاکِ داماں پر

وہ مجرم ہوں کہ جس کو پا بجولانی سے راحت ہے
وہ قیدی ہوں گماں ہے اپنے گھر کا جس کو زنداں پر

وہ گیسو ہوں جو ہے اُلجھا ہوا خود پیچ میں اپنے
وہ شانہ ہوں جو ڈورے ڈالتا ہے زلفِ جاناں پر

وہ عابد ہوں کلیسا جس کو ہر قلبِ مُصفّا ہے
وہ زائر ہوں چڑھاتا ہے جو نذریں کعبۂ جاں پر

وہ جادہ ہوں جو کر دیتا ہے ظاہر چور راہوں کو
وہ پردہ ہوں جو پڑ جاتا ہے اکثر چشمِ درباں پر

وہ رہرو ہوں جسے گم گشتگی خود اپنی رہبر ہے
وہ رستہ ہوں کہ جاتا ہے صراطِ بحرِ امکاں پر

وہ جوہر ہوں جو پنہاں ہے جگر میں سنگ ریزوں کے
وہ ہستی ہوں بنا جس کی ہے ذرّاتِ پریشاں پر

تو یوں تو میں سب کچھ ہوں کہنے کیلئے ورنہ
وہ قصّہ ہوں جگہ جس کو ملے گی طاقِ نسیاں پر

شکوۂ ابر

"اس نظم کی تصنیف کے کئی سال بعد یعنی ۱۹۳۲ء میں معلوم ہوا کہ اسی قافیہ اور ردیف میں ایک نظم رسالہ "ادیب" مرحوم کے اوراق کی زینت ہو چکی تھی، اور یہ محترم قبلہ جناب محمد ہادی عزیز مبرور کی تصنیف تھی، افسوس کہ مولانا بھی احباب رفتگان کی صف میں شامل ہو گئے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ جس زمین میں مولانائے مرحوم نے گلکاریاں فرمائی ہیں اسی میں مجھے بھی اظہار جذبات کا شرف حاصل ہوا ہے۔

ترے کرم کی ہے دنیا امیدوار برس
برس خدا کے لئے ابر نو بہار برس

دکھا نہ ہم کو زیادہ اب انتظار برس
نہ بے رخی کا طریقہ کر اختیار برس

جو اتنی دھوم سے آیا ہی گھر کے گردوں پر
ہے تجھ کو کس کے اشارے کا انتظار برس

زمیں کا خشک جگر ہی تپش سے گرما کی
تمام خلق اُسی سے ہے بیقرار برس

دکھا تو ہم کو کہ پانی ہے کس قدر تجھ میں
بٹھا دے ظرف کا تو اپنے اعتبار برس

پپیہے پھوڑ خوشی سے کہ دل کو تسکیں ہو
نکال، دل میں بھرا ہو جو کچھ بخار، برس

نہ تشنہ کاموں کو مایوس کر دعائیں لے
فغانِ بلبلِ بے مہر اک قریہ و دیار، برس

جھلس کے راکھ ہوا کار و بارِ صحرا کا
شجر شجر ہے تپاں صورتِ چنار، برس

یہ ہیں پہاڑ کہ جلتے ہوئے پجاوے ہیں!
ہیں پانی مانگ رہے تجھ سے آبشار، برس

جلامئی کا نظارہ دکھا دے میداں میں
بڑھا دے رونقِ ہر دشت و کوہسار، برس

غبار و گرد سے گردوں کا صاف مطلع ہو
دماغِ ارض کا ہو دور انتشار، برس

یہ تیری خشک مزاجی یہ ماہ ساون کا
ذرا تو نخل پہ اپنے ہو شرمسار، برس

ترے کرم سے ہو سرسبز وادی غربت
کہ راہ میں نہیں اک نخلِ سایہ دار، برس

کرم صفت ہے تری ہاں کرم نمایاں کر
بنا ہے کس لئے اب کے ستم شعار، برس

لگے گی آہ تجھے بے گنہ پرندے کی
نہ کر پپیہے کا ظالم جگر فگار، برس

ہے منحصر تری بخشش پہ آس دہقاں کی
کسی غریب کو یوں رکھ نہ سوگوار، برس

گلوں کے حلق میں کانٹے پڑے ہیں بستاں میں
ہے خشک شاخِ شجر پر زبانِ خار، برس

ہمارے واسطے کھل جائے تیرا گنجینہ
ملیں ہمیں کبھی ترے دُرِ شاہوار، برس

فسردگی کا مٹے دور تازگی آئے
کہ نخل نخل ہے محتاجِ برگ و بار، برس

ترس رہی ہے یہ اب بوند بوند پانی کو
خدا کے واسطے سن خلق کی پکار، برس

یہ وقت چھیڑ کا دوشیزۂ چمن سے ہے
شباب ان کا دکھانے کو ہے اُبھار، برس

کرا دے سیر حسینوں کو رنگ و نکہت کی
دکھا دے جھولوں کا نظّارہ خوشگوار، برس

لگائے تان کوئی دل فریب کجری کی
اُڑائے ہوش کوئی گا کے پھر ملار، برس

پڑے پُھوار، جمے راگ رنگ کی محفل
کہ محوِ شغل ہوں رندانِ بادہ خوار، برس

ہزار بار جو برسا ہے اپنی موج سے تُو
ہمارے کہنے سے بھی اے دوست ایک بار، برس

یہ کیا؟ کہیں تو ستم ڈھا دیا ہے طوفاں سے
زمیں کہیں کی ہے محرومِ فیضِ باراں سے

کوئل

چٹکیاں لیتا تھا دل میں ورد ارمانِ بہار ۔۔۔ رُونما دشت و چمن میں ہو گئی جانِ بہار
جلوہ گر پھر میری محفل میں ہے مہمانِ بہار ۔۔۔ اس کی آمد سے دوبالا ہو گئی شانِ بہار

اس کی خاطر کیا کروں، اس کی تواضع کیا کروں
اس کے نغموں کی بیاں شانِ ترفع کیا کروں

آبِ حیواں میں اثر ہیں نغمہ ہائے خوشگوار ۔۔۔ صرف اس سے ایک گھونٹ امرت کا ہوا امیدوار
اس ترنم پر تصدق ان ترانوں پر نثار ۔۔۔ میں انھیں نغموں کو سننے کیلئے تھا بیقرار

کس قدر مانوس ہوں اس کی صدائے ناز سے
ہو گیا ہے سحر سا اک دل پر اس آواز سے

صبح دم پہلے یہی آ کر جگاتی ہے مجھے
یادِ ایامِ مسرت زا دلاتی ہے مجھے

کس قدر جادو بھرے نغمے سناتی ہے مجھے
بانسری والے کی گویا یاد آتی ہے مجھے

یہ نہ ہو جب ہند میں پھر نغمۂ دلجو کہاں!
یہ کُوا اُو کُوا اُو کُوا اُو کُوا اُو کُوا اُو کہاں

وہ جو میں نے عہدِ طفلی میں لگایا تھا انار
اب دکھاتا ہی مجھے کھِل کھِل کے پھولوں کی بہار

لکہ ہائے ابرِ مشرق سے چلے مستانہ وار
دھوپ کا جلوہ ہی اس موسم میں کیسا خوشگوار

ہے مسلط آسماں پر کیا فضائے دلفریب
چل رہی ہے ہر طرف پنکھا ہوائے دلفریب

اے منور ہے گوارا یہ اُمس برسات میں
ہے زیادہ شہر سے دلکش سماں دیہات میں

دیکھتا ہوں جلوۂ قدرت عیاں ہر بات میں
ایک ہنگامہ سا پیدا ہے مرے جذبات میں

شوق سے اس کے ترانے صبحدم سنتا ہوں میں
مجھ پہ طاری وجد ہو جاتا ہے سر دھنتا ہوں میں

برسات کی آمد

ملتا ہے پتہ یہ آسماں سے
گرمی کا عمل اُٹھا جہاں سے

برسات کی فصل آ رہی ہے
پیغامِ حیات لا رہی ہے

کانٹا سا پڑا جو حلق میں تھا
شورِ فریاد خلق میں تھا

افسردہ تھا ہر کسان کا دل
بوڑھے کا سا تھا جوان کا دل

لُوں کی شدّت سے فق تھے چہرے
گرمی سے عرق عرق تھے چہرے

طاری ہر اک پہ مردنی تھی
نخلستاں سی زمیں بنی تھی

نارِ دوزخ برس رہی تھی
پانی کو زمیں ترس رہی تھی

پھُولوں میں تھا التہاب پیدا
کانٹوں میں تھا اضطراب پیدا

بھُولے تھے پرند نغمہ خوانی
افسانہ تھا ذکرِ شادمانی

ہرنوں کو نہ چوکڑی کا تھا ہوش
صحرائیں پڑے ہوئے تھے خاموش

اب کاوشِ گرد باد ہے گرد
دم بادِ سمُوم نے بھرا سرد

صرصر کی شرارتیں ہیں بے کار   گرمی کی حرارتیں ہیں بے کار
بدلی جو ہواؤں کی روانی   ہر گردوں ہے پانی پانی
برسات کو پھر خدا نے بھیجا   ہے گاوِ زمیں کا تر کلیجا!
اُڑتی نہیں نام کو بھی اب خاک   حدّت نہ ہے دُھوپ کی غضبناک
کھیتوں میں ہے کتنی کثرتِ آب   پانی سے بھرے ہوئے ہیں تالاب
صحرا مثلِ چمن بنے ہیں!   گلشن رشکِ عدن بنے ہیں
ساحل کے لبوں پہ ہے تبسّم   دریاؤں میں ہے بپا تلاطم
ہے فصلِ نشاط عالم آرا   ہے رنگِ بہار آشکارا
طاؤس کا رقص دِل رُبا ہے   پُر لطف پپیہے کی صدا ہے
بادل کی گرج جنوں فزا ہے   بجلی کی کڑک میں اک ادا ہے
جب ابر سے چھا گیا اندھیرا   دل چھین کے لے گئی یہ میرا
اُمڈے مثلِ سحاب جذبات   لائی نقدِ حیات برسات
اس طرح سما گئی نظر میں   تسکیں نے کیا ہے گھر جگر میں

دیکھا رُوئے نگارِ قدرت
ہوتا ہوں میں ہمکنارِ قدرت

ایک وجدانی نغمہ

ارنڈ کا درخت اک چمن میں تھا لگا ہوا
چمن یہ اپنے لطف میں تھا خلد ساں بنا ہوا
تھا ایک خاص شان سے ہر ایک گُل کھِلا ہوا
ترانہ سنج اُس میں ایک مُرغِ خوشنوا ہوا
تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی

وہ مُرغِ خوشنوا تھا یا کوئی پری تھی اندر کی
تھی اُس کی نغمہ سنجیوں میں ایک طُرفہ دلکشی
ہوئی وہ دل کو تازگی کلی ہر ایک کھِل گئی
صدا یہ سُن کے صوفیوں کی چشمِ معرفت کھُلی
تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی

یہ مُرغِ خوش نوا نہ تھا، تھا کوئی عارفِ ولی
دیا تھا کردگار نے جسے کمالِ حق رسی
پڑی جو میرے کان میں، بِلا سرو بہ باطنی
صدائے خوش گوار یہ کچھ اتنی لطف خیز تھی
تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی

طلسم ریز اُس کے قلب میں خدا کی ذات تھی
کہ رُوح اِس پرند کی بہارِ کائنات تھی
ملی اس پہ دل سے تھا فدا نہاں وہ اس میں بات تھی
تھا راگ ایسا اس بھرا شکر بھی جس سے مات تھی
تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی

ہے عارف اس کو ماننے میں کیا کسی کو پیش و پس
مِٹا چکی ہے ذہن سے یہ اپنے جسم کا قفس!
نظر میں اس کی ایک ہی ہے اب وقارِ خار و خس!
زباں کو اس کی رٹ یہی لگی ہوئی ہے ہر نفس!
تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی

ضرور رہ چکا ہے یہ فضائے کوہِ طُور میں
سما چکا ہے اس کا دل خدا کے پاک نُور میں
ہے اک یہ مرغِ حق پرست حلقۂ طیور میں
کہ نغمہ سنج دیکھئے ہے عالمِ سُرور میں
تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی

خدا کے ذکر و فکر سے ہیں دور حضرتِ بشر
نہیں ہے اُس کی یاد سے پرند بے خبر مگر
منوّر اپنی سمت بھی تو دیکھ آنکھ کھول کر
گزر گر اب خودی سے ہاں یہ ذکر لا زبان پر
تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی تُو ہی

نیل کنٹھ

یہ نظم ایک قدرتی منظر دیکھ کر ۱۹۱۷ء میں کہی گئی تھی۔ اناؤ سے لکھنؤ تک بیل گاڑی کا سفر تھا۔ فروری کے مہینے میں بسنت کا موسم اپنے پُورے شباب پر تھا، دورانِ سفر ایک سڑک کے کنارے ایک بے برگ و بار درخت کی چوٹی پر نیل کنٹھ دکھائی دیا، جو واقعی کئی سال کے بعد نظر سے گزرا تھا۔ لکھنؤ پہنچ کر اسی منظر کی تصویر نظم میں کھینچی گئی۔

نیل کنٹھ اے نیل کنٹھ اتنے دنوں سے تھے کہاں؟
کیا ہمالہ کی گپھاؤں میں ابھی تک تھے نہاں؟

ایک عرصے سے تمھاری ہی تھی مجھکو جستجو
ایک عرصے سے تھی تم کو دیکھنے کی آرزو

گو خلش زا میرے دل میں آرزوئے دید تھی
آج ملنے کی نہ لیکن کوئی بھی اُمید تھی

کس لیے اتنا گلوئے دل رُبا ہے نیلِ فام
کیا تمھارا کوہِ گوری شنکروں پر ہے قیام

لے کے شو سے زہر کا اک جام تقسیمِ ازل
پی لیا تھا تم نے کیا ہنگامِ تقسیمِ ازل

نیل کی وادی سے اُڑ کر کیا یہاں آئے ہو تم
کیا کوئی تحفہ بھی میرے واسطے لائے ہو تم

میں اگر سمجھوں تمھیں زائر تو کچھ بے جا نہیں
میں نہ تم کو گر کہوں طائر تو کچھ بے جا نہیں

صحنِ گلشن میں نہیں اب خوشہ چینی کس لیے
عالمِ غربت میں یہ صحرا نشینی کس لیے

غالباً مشغول رہتے ہو ریاضت میں یہاں
اور ملتا ہے تمھیں اس طرح لطفِ جاوداں

بیٹھ کر خاموش اک نخلِ کہن کی شاخ پر!
ڈالتے ہو کس لیے رہ رہ کے تم مجھ پر نظر؟

آج کل رِتُّ[1] راج ہے ہندوستاں میں جلوہ گر
یہ گُلِ رنگیں ہے گلزارِ جہاں میں جلوہ گر

شام کے آثار مشرق سے عیاں ہونے لگے
خیمہ زن لب پر سئی[2] کے کارواں ہونے لگے

ایسے موسم میں بھی ہے شیریں نوائی سے گریز
کیوں ہو چپ آخر ہے کیوں نغمہ سرائی سے گریز

کیا مری مانند کوئی عاشقِ ناشاد ہو
ہجر میں کیوں قائلِ خاموشیِ فریاد ہو

غالباً میری طرح تم بھی جنونی ہو کوئی!
عاشقِ ناکام محبوبِ حقیقی ہو کوئی!

بات جو مجھ کو پسند آئی تمھیں آئی پسند
میں بھی تنہائی پسند اور تم بھی تنہائی پسند

پھول کا میں کام لیتا ہوں ہمیشہ خار سے
اُنس ہے مجھ کو بھی دشت و وادی و کہسار سے

---

[1] یعنی موسم بہار [2] اُناؤ کے قریب ایک چھوٹی سی ندی

فتنہ زارِ حشر ہے دُنیا کی آبادی مجھے
بخش دے خالق تمھاری طرح آزادی مجھے

میں تمھارے ساتھ ہی اب کے مناؤں گا بسنت
چہچہاؤ تم ذرا پھر میں بھی گاؤں گا بسنت

شانِ نزول

ہے یہ وہ جہاں جہاں سے شکلیں
وابستۂ نام ہو رہی ہیں

بے پردۂ عرش و فرش رہ کر
محجوب مقام ہو رہی ہیں

آنکھیں وہ جو بے خمار سی تھیں
اب بادہ بجام ہو رہی ہیں

جتنی بھی خموشیاں تھیں لب پر
مائل بکلام ہو رہی ہیں

وحدت کی ادائیں تھیں جو مخصوص
کثرت میں وہ عام ہو رہی ہیں

مرغِ آزاد کی نگاہیں
خود حلقۂ دام ہو رہی ہیں

بہکیں نہ قدم سے لغزشیں کیوں
مجبورِ خرام ہو رہی ہیں

قرباں ہیں لامکانیوں کے
صرفِ در و بام ہو رہی ہیں

اُف رے آزادیاں کسی کی
اپنی ہی غلام ہو رہی ہیں

رُباعیاتِ بہار

اندازِ ستم میں آفتِ جاں نکلا
ظالم بخیالِ خونِ ارماں نکلا
آنِ واحد میں گُل کھلائے لاکھوں
جب بن کے بہار حُسنِ عُریاں نکلا

آنکھیں جھپکا کے مُسکرانے والے
مستی برسا کے لڑکھڑانے والے
ہاں مجھ پہ سنبھل کے ڈال جادو اپنا
ہیں میرے قدم بھی ڈگمگانے والے

اے دعوتِ کیفِ حال دینے والے
دل کے ارماں نکال دینے والے
دیکھوں میں بھی کہ سحر کیا کرتے ہیں
آنکھیں آنکھوں میں ڈال دینے والے

دریا میں بپا نہ کیوں تلاطم ہو جائے
موجوں میں بہم نہ کیوں تصادم ہو جائے
دل کے ارماں تڑپ نہ اٹھیں کیسے
جب کوئی کہیں محوِ تبسم ہو جائے

مرجھائے ہوئے پھول مہک اٹھتے ہیں
انگارے بجھے ہوئے دہک اٹھتے ہیں
حرکت میں جمادات کو لاتی ہے بہار
مرغانِ زباں بند چہک اٹھتے ہیں

سرخی یہ لبِ خموش پہ ہے کس کے
پھولوں کی کماں یہ دوش پر ہے کس کے
حسنِ عریاں میں بجلیاں سی بھر کر
حملہ یہ جہانِ ہوش پر ہے کس کے

نزولِ حیا

آب و گِل سے جب نمایاں ہو گئے آثارِ حُسن
دستِ قدرت نے دیا ترتیب جب گلزارِ حُسن

رہ گیا کچھ نامکمّل سازو سامانِ کشش
دِلربا رنگینیوں سے تھا نہ دامانِ کشش

اور سب اجزائے گوناگوں بہم ملتے رہے
اس چمن میں پھُول گو یہ مدّتوں کھلتے رہے

عشوۂ دمساز بھی تھا غمزۂ غمّاز بھی
ناز بھی اس کا حسیں تھا دِلرُبا انداز بھی

تاہم اِن پھولوں میں شانِ دلربائی ہی نہ تھی
کافرانداز ی میں شامل پارسائی ہی نہ تھی

پھول یہ اک جوہرِ نایاب سے محروم تھے
گوہرِ غلطاں تھے لیکن آب سے محروم تھے

لاجونتی کا تبسم ان پہ لایعنی نہ تھا
نرگسِ شہلا کا خندہ اِن پہ بے معنی نہ تھا

ان کی اس بے مائگی پہ یاسمن تھی خندہ زن
اِن کی رسوائی پہ آمادہ بھی بوئے نسترن

اِن گلوں سے قطرہ زن عطرِ جوانی ہی نہ تھا
تیرتیں یہ کشتیاں جس میں وہ پانی ہی نہ تھا

چونک اُٹھی قدرت یکایک یہ نظارہ دیکھ کر
اک نظر ڈالی پھر اُس نے حُسن کی تصویر پر

جامۂ نسوانیت سے دے کے اس قالب کو زیب
ایک جوہر اس میں ڈالا آبدار و دلفریب

جُنبشیں پلکوں کی تہذیبِ حیا سے رُک گئیں
حُسن جاذب بن گیا جس وقت آنکھیں جُھک گئیں

بہادری

کیا بتائیں تمہیں ہم، چیز شجاعت کیا ہے
فلسفہ اس کا ہے کیا، اسکی حقیقت کیا ہے

ہم نے جب دیدۂ تحقیق سے دیکھا ہے اسے
کچھ سوا عرش سے بھی اوج میں پایا ہے اسے

ہے شگفتہ چمنِ فطرتِ انساں اس سے
روح کا جوہرِ پنہاں ہے نمایاں اس سے

شمعِ اخلاق کی لَو، نیرِ تہذیب کی ضَو
حُسنِ باطن کا ہے یہ ایک جلالی پرتو

صیقلِ آئینۂ جوہرِ ایثار ہے یہ
بیگناہی پہ کھڑی ہے جو وہ دیوار ہے یہ

مُدّعا رحم کا انصاف کا مقصد ہے یہ
ان اقالیم کی اک باہمی سرحد ہے یہ

نہیں ہر اک پہ عیاں رازِ نہانی اس کے
مختلف جور و ستم سے ہیں معانی اس کے

مرتبہ جانتا ہے ایک زمانہ اس کا
پاک تر ترک کے بانے سے ہے بانا اس کا

امنِ عالم کے تحفّظ کی سبیل اس سے ہے
تیغِ اخلاق اگر ہے تو وصیل اس سے ہے

نام کو بھی نہیں باطل سے ہی رشتہ اس کا
عشق کے جذبۂ کامل سے ہی رشتہ اس کا

حسنِ صورت کا وجود اسکی بقا میں شامل
حُسنِ سیرت کا نشاں اسکی حدوں میں داخل

ہے جہاں حُسن شجاعت بھی ہے موجود وہاں
ہے جہاں عشق وہیں اس کا پیدا اِمکاں

بادۂ روح کا پیمانہ ہے رنگیں اس سے
حُسن اور عشق کا افسانہ ہے رنگیں اس سے

جب شجاعت کی بدولت ہوئی حیوان کی قدر
کیوں نہ پھر اس سے بڑھے دہر میں انسان کی قدر

شیر ممتاز اگر ہے تو شجاعت سے ہے
اس کا اعزاز اگر ہے تو شجاعت سے ہے

منحصر یہ نہیں دولت کی فراوانی پر
کچھ مدار اس کا نہیں شوکتِ سلطانی پر

ہے بڑی بات شجاعت کا میسّر ہونا
نہیں ہر شخص کی قسمت میں سکندر ہونا

ہے اگر سلسلۂ عمر کو گھٹنا، گھٹ جائے
مدّعا اس کا ہے، ہر راہِ وفا میں کٹ جائے

زیر دستوں پہ کبھی ہاتھ نہ زنہار اٹھے
حق پرستوں پہ نہ تیغِ جگر افگار اُٹھے

رَن میں دائم ہے پامالیٔ باطل آنا
جو زبردست ہو صرف اس کے مقابل آنا

ہم نے سمجھی ہے جو کچھ اس کی حقیقت ہے یہی
یہی مردانگی ہے اور شجاعت ہے یہی!

راجپوتی حُسن

یا

اُپلے والی

(سفر جے پور کے ایک دلفریب منظر کی یاد)

اک شب کو جب میں ہمدم مصروف تھا سفر میں
گو جسم ریل میں تھا، رکھی تھی جان گھر میں
روشن تھا میرے دل میں بُجھ کر چراغِ مُحسن[1]
کرتی تھی کام اپنا تاثیرِ داغِ محسن
سینے کا گوشہ گوشہ ماتم کدہ بنا تھا
قدرت کی مصلحت سے میں غمزدہ بنا تھا

---

[1] اشارہ ہے ماموں صاحب قبلہ جگدمبا پرشاد صاحب ضا قیصر لکھنوی کے انتقال کی طرف

ہیں پھر بھی تھا اکیلا گو ہم سفر کئی تھے
ڈبے میں جس قدر تھے، دنیا کے آدمی تھے
سانچے میں شعریت کے کوئی نہیں ڈھلا تھا
اک میں ہی تھا جو اس کے آغوش میں پلا تھا
پڑھ کر کلیم دہلی[1] بہلا رہا تھا دل کو
تسنیم میں ادب[1] نہلا رہا تھا دل کو
تسکین کی فضلِ حق[2] نے صورت مجھے دکھا دی
آنکھوں کے سامنے تھی جنگل کی شاہزادی[3]!
تھی مظہرِ لطافت اک دیدہ زیب سُرخی
آنکھوں میں بس رہی تھی، یہ دلفریب سُرخی
جذباتِ جوشؔ کی یہ منظوم داستاں تھی
رگ رگ میں زندگی سی جس سے رواں دواں تھی

---

[1] کلیم دہلی، شاعرِ انقلاب محترم حضرت جوش ملیح آبادی کا قوم پرست رسالہ (۲) مسٹر فضلِ حق قریشی ایم۔ اے (۳) جنگل کی شاہزادی، حضرت جوش ملیح آبادی کی ایک نہایت کامیاب نظم

تھا جانستاں وہ منظر جے پور کے سفر کا!
تھا کلکِ جوش گویا رہزن دل ونظر کا!
اک حُسن خوابِ منزل آنکھوں میں جلوہ گر تھا
بھڑکا وہ بن کے شعلہ سینے میں جو شرر تھا
میں سیر کر رہا تھا رنگینیٔ نظر کی!
یاد آ گئی مجھے بھی جے پور کے سفر کی!
دل میں خیال بن کر وجہ فساد آیا
جُھرمٹ وہ لعبتانِ سیمیں کا یاد آیا
جن کے قدم غلط یوں پڑتے اِدھر اُدھر تھے
چھٹکے ہوئے ستارے گویا زمین پر تھے
اک چاند بھی مگر اُس جُھرمٹ میں جلوہ گر تھا
تھی تاج کی عمارت یا قالبِ بشر تھا
پتّھر کی مورتی میں پڑتی تھی جان جس سے
چکّر میں آ رہے تھے ہفت آسمان جس سے

شیریں بیانیاں تھیں رنگیں نوائیاں تھیں
ملبوس پارسا میں کافرادائیاں تھیں
محشر خرامیاں تھیں رعنائیوں میں اس کی
تھا ماہِ نو کا پرتو انگڑائیوں میں اس کی
گالوں کی تازگی میں گلشن مہک رہے تھے
آنکھوں کی پتلیوں سے تارے چھٹک رہے تھے
بھر بھر کے جامِ صہباگُل کو پلا رہی تھی
ہونٹوں کی مُسکراہٹ کلیاں کھلا رہی تھی
انداز تھا انوکھا، تھی ہر ادا اچھوتی
پلکیں چلا رہی تھی، تلوار راجپوتی
اُپلوں کا ٹوکرا اک رکھا ہوا تھا سر پر
سینے پہ بوجھ تھا کچھ، کچھ بوجھ تھا کمر پر
یہ تو خدا ہی جانے کیا بات کر رہی تھی
پُھرتی میں تتلیوں کو بھی مات کر رہی تھی

زیور نہ زیب تن تھے پھر بھی سجی ہوئی تھی
نازک بدن تھی ایسی گویا چھوئی مُوئی تھی
اس نازکی میں لیکن شامل تھا بانکپن بھی
پھولوں کی شاخ میں تھے تلوار کے چلن بھی
تھی آن کی پجارن یہ بات کی دھنی تھی
عفّت میں لکشمی تھی، عصمت میں پدمنی تھی
دامانِ بوالہوس کو پیروں سے روندتی تھی
خرمن پہ معصیت کے بجلی سی کوندتی تھی
بُھولے سے بھی جو آکر اس کو وہ چھیڑ دیتی
پیراہنِ صبا کے بخیئے اُدھیڑ دیتی
روکے تھی زورِ بحرِ عصیاں کے جزر و مد کا
ہوتا تھا سرد شعلہ اس سے نگاہِ بد کا
پاکیزگی کا جوہر کرتا تھا ضو فشانی
تھی جس کے گھر کی رانی، تھی اُس کے گھر کی رانی

تھی رشکِ صد امارت اُس کے لیے غریبی
ناداریوں میں اس کی شامل تھی خوش نصیبی
تابانیوں سے اُس کی تسخیر تھا زمانہ
دولت سے حُسن کی تھا معمور یہ خزانہ
یہ بھی نہ راستے میں معصوم کو پتا تھا
کون اس کی سمت کیسی نیّت سے دیکھتا تھا
کھینچے تھی ہاتھ اپنا نذرِ دل و جگر سے
بے لاگ شمع تھی یہ پروانۂ نظر سے
عصمت کے بوستاں کی اک منہ بند ہی کلی تھی
صرف اپنے کرشن کی ہی رادھا یہ لاڈلی تھی
میری نگاہ میں بھی گو اس سے خیرگی تھی
نفسِ زبوں کی لیکن کافور تیرگی تھی
میرے لیے بھی فتنہ گو حُسنِ دل رُبا تھا
لیکن جمالِ قدرت میں اس میں دیکھتا تھا

دل میں یہ سوچ کر میں لیکن تھا وقفِ حیرت
اُپلوں کے پاتھنے سے کیا دلبری کو نسبت
جو پیکرِ حسین ہو لعل و گہر کے لائق
جس کی جبینِ تاباں ہو تاجِ زر کے لائق
ہو درخورِ حکومت جس کی یہ کج نگاہی
دیتا تھا زیب جس کے تن پر لباسِ شاہی
ناگن فسوں میں جس کی زُلفوں کا سلسلہ ہے
کیسے اہیرنی کا جامہ اُسے مِلا ہے
ہر وقت باندیوں کو رہنا تھا ساتھ جس کے
مہرِ لبِ شہی کے قابل تھے ہاتھ جس کے
فطرت کی لغزشوں سے کیوں جائے اُس کے ماتھے
جو حُسن کی ہو دیوی اُپلے وہ آہ! پاتھے

—

ہولی کا ایک لطیف تخیل

دیکھنا اُٹھ کر کہ کس کے پاؤں کی آہٹ ہے یہ
آگ یہ کس نے لگا رکھی ہے بن میں ڈھاک کے
اک جھلک ہے یہ کسی کے آتشیں رخسار کی
ہم بہت مشتاق تھے اس کے جمالِ پاک کے

کھڑکھڑاہٹ ڈھاک کے پتّوں کی بے معنی نہیں
وہ کہیں چشمک زنِ گردوں ہے شعلہ آگ کا
رند دَورِ آخری میں مست ہیں ساغر بدست!
سرزمینِ ہند میں آیا ہے موسم پھاگ کا

اک بلا کا سحر ہے نیرنگیٔ دنیائے چشم
اس میں کچھ موسم کی تبدیلی کی بھی تاثیر دیکھ
رُخ ہوا کا جس طرف بدلا اُدھر پہنچی نگاہ
انقلابِ دہر کی یہ دلفزا تصویر دیکھ

چھیڑ کی لیتا ہے پہلو سے بغلگیری کا شوق
دل جگر کے ساتھ اُچھلتا ہے خوشی سے جوش میں
بے خودی کا رنگ آنکھوں سے ہے کیا کیا آشکار
پھول بن کر جانشیں کوئی ہوا آغوش میں

بانس باڑی سے لڑی رہتی ہے کیوں اوشا کی آنکھ؟
کہہ رہی ہے کس سے آخر خواب پچھلی رات کا
ہے کہیں کوئی مصوّر، کوئی شاعر بھی یہاں
کون کر پائے گا اندازہ مرے جذبات کا

چال مستانہ نمایاں اک عروسانہ حجاب
اُف اُچھلتا پاؤں اس رفتار پر مفتوں ہوں میں
اک بیں پردہ ادائے باطنی ہے آشکار
ہر نفس دلدادۂ اندازِ گوناگوں ہوں میں

—

آنکھ جھپکائے ہوئے منہ اُس طرف سینے پہ ہاتھ
آنکھ بھر کر اپنے پہلو میں نظارہ بھی کیا
بے حجابانہ دکھائی حُسنِ باطن کی جھلک
پھر حیا سے رازداری کا اشارہ بھی کیا

—

آنکھ کے پردوں میں ناچیں مست ہو کر تتلیاں
نشۂ بے مے کی مستی میں غضب کا جوش ہے!
بات رندانِ بلاکش کو بھی یہ حاصل کہاں
بیخودی میں ہوشِ بے ہوشی کا کس کو ہوش ہے

—

شبنمی چادر بدن پر اور ہلکا سا لباس
مل گئی گویا جبینِ ناز پہ چُپکے سے ڈھول
کیوں نہ خارستاں میں کانٹوں کو بھی سُوجھے چھیڑ چھاڑ
بوسہ کش کیوں دستِ رنگیں سے نہ ہوں ٹیسو کے پھول

—

ہر پلک آنکھوں سے کہتی ہے کہ پچکاری چلے
اس کے دم دم پر جھپکنے کا یہی شاید ہے راز
قمقموں سے چوٹ کرنے کے لیے سینہ سپر
بے خودی میں آہ دستِ شوق ہیں ہر سُو دراز

—

اے منوّر دل پہ کوئی رنگ چڑھنا شرط ہے
خود بخود کھُل جائے گا تیری سخن سنجی کا راز
حُسنِ باطن کا کروں گا فاش میں پردہ ضرور
دیکھ پہلو مارتا ہے یوں حقیقت سے مجاز

—

بسنت

پھر کچھ بدل رہی ہیں خورشید کی نگاہیں
اُٹھنے لگیں دلوں سے پھر گرم گرم آہیں
لبریز ہو رہا ہے پیمانۂ زمستاں
آیا ہے خاتمہ پر افسانۂ زمستاں
موقوف ہو رہی ہے گردوں سے برفباری
دامانِ کوہ میں ہیں پھر آبشار جاری
سرما کی تھی وہ شدّت جھیلیں جمی ہوئی تھیں
تھا ملتوی تموّج نہریں تھمی ہوئی تھیں
پہلے کی طرح اُن میں پھر آ گئی روانی
اک جنبشِ ہوا سے پھر ہو گئے ہیں پانی

پھر موم ہو رہے ہیں جو سنگ دل بنے تھے
سیّال ہیں وہ دریا جو یخ کی سِل بنے تھے
بادِ شمال میں اب عنقا ہے زورِ طوفاں
بادل پھٹے پھٹے سے ہیں کچھ ہوا میں پرّاں
سردی جو اک جہاں کو بے موت مارتی تھی
ارض و سما پر اپنی گرمی اُتارتی تھی
بے چارگی پہ اشکِ حسرت بہا رہی ہے
اُٹھتے ہیں پاؤں اُس کے دنیا سے جا رہی ہے
جاڑا ہے اب نہ گرمی موسم[1] بسنت کا ہے
دنیا بسنت کی ہے عالم بسنت کا ہے
ہر چیز سے ہے پیدا رنگِ بہار پیدا
ہے عالمِ سکوں میں اک انتشار پیدا
طوفاں سمندروں میں دریاؤں میں ہے تلاطم
کہسار میں دو رویہ آمادۂ تصادم

---

[1] صحیح تلفظ موسِم بکسر سین مہملہ ہے مگر اردو میں موسَم بالفتح سین مہملہ بھی مستعمل ہے۔

قدرت نے کی ہیں پیدا رنگینیاں فضا میں
نکہت ہے زعفراں کی ہر موجۂ ہوا میں
نیرنگیٔ تصوّر مضطر بنا رہی ہے
فتنے جو سو رہے تھے اُن کو جگا رہی ہے
جذبات کا تقاضا پیہم اُبھارتا ہے
چھپ چھپ کے کون آخر یہ تیر مارتا ہے
کچھ ہاتھ پاؤں ایسے بے رحم نے نکالے
دل سب کے ہو رہے ہیں اللہ کے حوالے
زینت کمانِ گُل سے ہے دستِ نازنیں کی
مہتاب میں ضیا ہے اِس کے رُخِ حسیں کی
لب مائلِ تبسّم آنکھوں میں کیف پنہاں
سیّارہ وار جن میں ہر مردمک ہے رقصاں
ہے ارتعاش جس سے دنیائے دل میں پیدا
اک حالتِ تزلزل ہے آب و گِل میں پیدا

دیکھا ہے اِس ادا سے مدہوش کر دیا ہے
مدہوش کر دیا ہے خاموش کر دیا ہے

اندامِ دل رُبا ہیں بے لوث پیرہن سے
محجوب ہی نہیں ہیں عُریانیٔ بدن سے

رعنائیوں میں پیدا طفلانہ شوخیاں ہیں
طفلانہ شوخیاں ہیں مستانہ شوخیاں ہیں

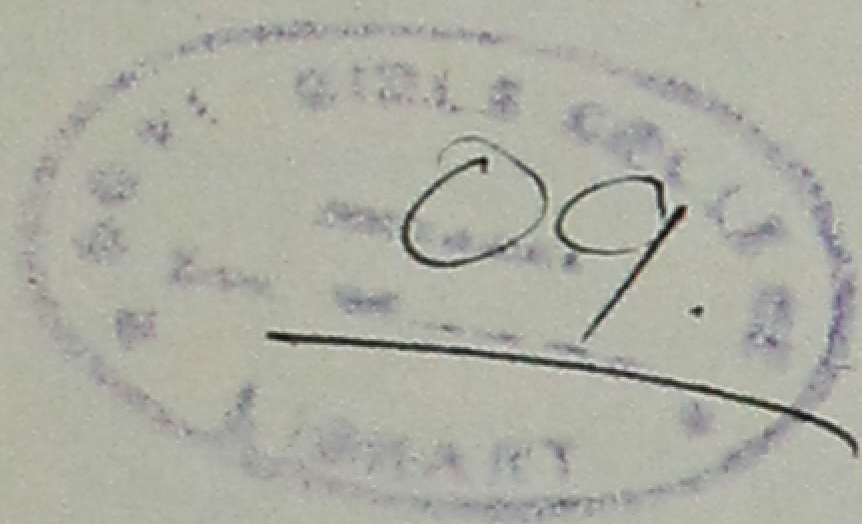
مستانہ شوخیاں ہیں صبر و سکوں کی رہزن
رندانہ شوخیاں ہیں تقوے کی خاص دشمن

بالوں کے پیچ سب کو چکّر میں ڈالتے ہیں
دل کی تباہیوں کے پہلو نکالتے ہیں

معصومیت گُندھی ہے ہر رشتۂ نظر میں
گلہائے جاں فزا کی ہے گردھنی نظر میں

ہے مُشک کا خزانہ نافِ شکم نہیں ہے
منظر یہ دیکھنے کا آنکھوں میں دم نہیں ہے

اس سحر سے خدائی مسحور ہو گئی ہے
مسحور ہو گئی ہے، مجبور ہو گئی ہے
ایسا سماں بندھا ہے۔ ایسی ہوا چلی ہے
مائل شگفتگی پر ہر مُنہ بندھی کلی ہے
شاخِ شجر سے لپٹی ہیں دل فریب بیلیں
طاؤس کر رہے ہیں گلزار میں کلیلیں!
قمری ہو خواہ بلبل، کوئل ہو خواہ سارس!
کم بخت دل کے ہاتھوں سب ہو رہے ہیں بے بس
چکّر میں فصلِ گُل کے زاغ و زغن پڑے ہیں
جنگل میں ہرنیوں کے پیچھے ہرن پڑے ہیں
اس فصل کا اثر ہے از مہ تا بما ہی!
ہر لب پہ آج کل ہے فریادِ بے پناہی!
ایسے میں ہو الٰہی حسرت زدہ نہ کوئی
مرگِ وفا سے دل ہو ماتم کدہ نہ کوئی


09.